اپنی آواز
رضا علی عابدی

ترتیب

نام چھپانے کا موسم

اُس روز آسمان سے سونا برس رہا تھا۔

ایک توسیب کے پھول کھلے تھے اُوپر سے دُھوپ یُوں چمکی کہ سونا
برسنے ہی کا گمان ہوا۔ میں نے کھڑکی کا پردہ جو کھولا تو دھوپ گلال کی طرح
اُڑتی اندر چلی آئی۔ نیچے سڑک پر خُوب رونق تھی۔ عورتیں رنگ برنگے لباس
پہنے کام پر جا رہی تھیں، لڑکیوں نے کلیوں کی رنگت جیسی لپ اسٹک لگائی
تھی۔ اسکول جانے والے بچے اُس دن اُچھل اُچھل کر چل رہے تھے۔

میں جتنی دیر نہاتا اور لباس بدلتا رہا، سارے ہی پُرانے گانے
ایک ایک کرکے زبان پر آتے گئے۔ آئینے کے سامنے 'آئی بہار آج آئی
بہار' گایا تو میں اپنے آپ کو پنکج ملک لگا۔ میں نے گلابی قمیص پہنی، ویسی
ہی ٹائی باندھی، گھر سے نکلتے ہوئے کالر میں گلابی پھول بھی لگایا اور سیٹی پہ
کوئی گانا گاتا اسٹیشن کی طرف چلا۔

مسٹر پٹیل کے سب پوسٹ آفس کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ ایک
چھوٹی سی لڑکی پنجوں پر اُونچی ہو کر سگریٹ کا ایک خالی پیکٹ سُرخ لیٹر بکس
میں ڈالنے کی کوشش کر رہی ہے۔ مجھے آتا دیکھ کر وہ جھٹ الگ ہو گئی،

جیسے وہ کچھ بھی نہیں کر رہی تھی۔

ننھی لڑکی کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے جھک کر اسے "ہیلو" کہا اور پوچھا: "تمہارا کیا نام ہے؟" اُس نے جو گھور کر دیکھا تو میری سیٹی بے سُری ہو گئی۔ میں مسکرایا اور آگے بڑھ گیا۔

اگلے روز بھی دُھوپ خُوب چمکی۔ صبح تڑکے ہی سامنے والی چینی پروہ چڑیا آن بیٹھی جو سال کے سال بڑی باقاعدگی سے یُوں آتی ہے جیسے موسمِ بہار اپنے ساتھ وہی لاتی ہو۔ اُس روز بھی وہ دیر تک گاتی رہی۔

اپنے چہرے پر خوب بہت سے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دینے کے بعد اُس دن اپنی ہتھیلی پر کچھ زیادہ ہی آفٹر شیو لوشن نکالا۔ جتنا چہرے پر لگا، وہ لگا باقی اپنی قمیص پر پونچھا، اور گنگناتا ہوا گھر سے باہر نکلا تو ڈاکئے نے بڑی گرمجوشی سے سلام کیا۔ جاڑوں میں یہی ڈاکیا صرف گردن ہلا کر رہ جاتا تھا۔

میں سڑک کے اُس رخ پر چلا جدھر دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور جہاں پھولوں سے لدی شاخیں پیدل چلنے والوں کے بالوں سے اُلجھ رہی تھیں اور رخساروں کو چھو رہی تھیں۔ سڑک کے اسی کنارے مسٹر پٹیل کا سب پوسٹ آفس ہے۔ میں قریب پہنچا تو دیکھا کہ وہ کمسن لڑکی سرخ لیٹر بکس کے چکر کاٹ رہی ہے اور گا رہی ہے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ ٹھٹھک گئی اور ڈر کر یوں دیکھنے لگی جیسے اُسے پہلے سے خبر ہو کہ میں آج بھی اس کا نام پوچھوں گا۔

میں نے قریب جا کر کہا: تمہارا کیا نام ہے۔

یہ سننا تھا کہ وہ سر پہ پیر رکھ کر بھاگی۔ لندن کی سڑکوں پہ ہرنی کو بھاگتے

دیکھا تو میری سیٹی کی لے اونچی ہو گئی۔ ہنستا ہُوا میں آگے بڑھ گیا۔ اُس روز کی سنہری فضا میں اپنے جوتوں کی کھٹ کھٹ بہت اچھی لگی۔

اگلے روز بھی کمال ہُوا۔ محکمۂ موسمیات کی پیشین گوئی سچی نکلی۔ صبح ہوئی تو ہوا بھی دھوپ میں نہائی ہوئی تھی۔ اچانک گرمی پڑی تو شاخوں پر لدے پھولوں کی پنکھڑیاں بکھر کر پگڈنڈیوں پر پھیلنے لگیں اور اسکول کو جانے والے بچّے خوش ہو ہو کر اپنے بستے ہوا میں گھمانے لگے۔ ساتھ میں وہ خود بھی گھومتے جاتے تھے اور کھلکھلا کر ہنستے تھے۔

جی چاہا کہ میں بھی اُن میں شامل ہو جاؤں اور اُن سب سے ان کے نام پوچھوں۔ مجھے مسکراتا دیکھ کر وہ بھی مسکرائے۔ کسی نے ہیلو کہا اور کسی نے گڈ مارننگ! اُن کی ماؤں نے کہا، کیسا اچھا دن ہے۔ ہے نا؟ اور میں ہر ایک کی ہاں میں ہاں ملاتا ہُوا جب مسٹر پٹیل کے سب پوسٹ آفس کے سامنے پہنچا تو وہ کمسن لڑکی سرخ لیٹر بکس سے ٹیک لگائے ایک کمانی دار کھلونے کو چابی دیئے جا رہی تھی۔ اس کی کمانی کبھی کی ٹوٹ چکی تھی۔

اس کا سارا دھیان کھلونے میں لگا تھا لیکن وہ سر اٹھا کر اُدھر بھی دیکھتی جاتی تھی جدھر سے میں آتا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کھلونے پہ یوں جھک گئی جیسے میرے آنے کی اُسے خبر تک نہ ہو۔

میں نے اس کے پاس پہنچ کر کہا: تمہارا نام کیا ہے؟

اس نے سنی اَن سنی کر دی اور کھلونے میں جلدی جلدی یوں کوک بھرنے لگی جیسے وہ میلا کچیلا بندر پل بھر میں ناچ ناچ کر اپنا باجا بجانے

لگے گا۔ میں خوب ہنسا اور بائی بائی کہتا ہوا اسٹیشن کی طرف بڑھ گیا۔ سڑک پر پھولوں کی اتنی زیادہ پنکھڑیاں بکھری ہوئی تھیں کہ جوتوں میں وہ کل جیسی کھٹ کھٹ نہ تھی، مگر میں خوش تھا۔

اگلے دن کا سُورج بجھا بجھا سا نکلا۔ نہ وہ سونے کی برسات ہوئی اور نہ سامنے والی چمنی پہ وہ چڑیا آئی۔ گہرے کالے بادل نیچے اتر آئے تھے اور اندھیری سڑکوں پہ چلنے والی ہوا بھی سرد تھی۔ بچے موٹے موٹے کوٹ پہنے گزرے۔ مائیں راستے بھر ڈانٹ ڈپٹ کرتی گئیں۔

اس روز میں بھی اداس تھا اور میرا دل بھی۔ گھر سے خط آیا تو وہ بھی بیماریوں اور طبیعت کی خرابیوں سے بھرا پڑا تھا۔ میں نے الماری سے اونی کوٹ نکالا۔ اس کی گرد جھاڑی اور چھینکتا ہوا گھر سے نکلا۔ ڈاکیے نے گڈ مارننگ بھی نہیں کہا۔ یا شاید کہا اور میں نے جواب نہیں دیا۔ ایک سائیکل سوار سے ٹکر ہوئی۔ ایک بلّی کی دم پہ پاؤں پڑا۔ نہ جانے کہاں سے جوتے میں ایک کنکر چلا گیا جو ذرا دیر بعد کانٹا بن کر چبھنے لگا۔

کیسا بوجھل دن تھا۔ میں سر جھکائے مسٹر پٹیل کے سب پوسٹ آفس تک جا پہنچا۔ وہ کمسن لڑکی سرخ لیٹر بکس سے لگی کھڑی تھی۔ میں اس کے قریب سے گزر گیا اور اگلے موڑ پہ مڑنے کو تھا کہ پیچھے سے ایک ننھی سی آواز آئی:

"سنو! میرا نام جولیا ہے۔"

اپنی آواز

جب میں چھوٹا سا تھا، سال کے سال بیمار ضرور پڑتا تھا۔ میں نڈھال ہو جاتا، ہاتھ پاؤں پھنکنے لگتے، آنکھیں جلنے لگتیں، خود اپنی سانس گرم محسوس ہوتی۔ بڑی بہنیں اپنی ٹھنڈی ہتھیلیاں میرے ماتھے پر رکھتیں اور میں بستر میں لٹا دیا جاتا۔

ڈاکٹر کے لال لال مکسچر پیتا تو اب مجھے اچھی طرح یاد نہیں البتہ یہ ضرور یاد ہے کہ کبھی امّاں اور کبھی باجیاں باری باری آتیں اور میرے ماتھے کو چھو کر کہتیں: حرارت ہے، یا بخار ہے، یا تیز بخار ہے۔

اس تیز بخار والے اعلان کے بعد گھر کے اونچے مچان سے قرآن اتارا جاتا، جزدان کی گرد جھاڑی جاتی اور مجھے قرآن کی ہوا دی جاتی۔ اُس میں سے نکلنے والی پرانے کاغذ کی سیلی ہوئی خوشبو مجھے اب تک یاد ہے۔ اپنے یہ چونچلے کرانا مجھے اچھا لگتا تھا۔

بچپن کے بخار کا وہ تکلیف دہ مرحلہ بھی مجھے یاد ہے جب سارا گھر کھانے کی خوشبوؤں سے مہکتا تھا لیکن میرے حصّے میں صرف میٹھا میٹھا لیس دار ساگودانہ آتا تھا۔ کتنی نفرت تھی مجھے ساگودانے سے۔

جب بخار کچھ کم ہو جاتا ـــــ تب خدا خدا کر کے مجھے قلیے کے شوربے میں ڈوبے ہوئے پُھلکے کے چھلکے ملتے تھے۔ کافی بدمزہ ہوتے تھے۔

اُن دنوں بستر میں لیٹنا کسی قید و بند سے کم نہ تھا۔ بار بار پسینے میں ڈوب کر ہر بار خشک ہو جانے والے لباس اور پلنگ کی چادر سے جو گھٹّے ذہی کی بو اٹھتی تھی اُس سے جی متلاتا تھا تو اماں لیموں کے ساتھ سیاہ مرچ چٹاتی تھیں۔

طبیعت جب ذرا بحال ہوتی تو اٹھ کر کھیلنے کو جی چاہتا تھا مگر اس کی اجازت نہ تھی۔ بیکار پڑے رہنے سے کس بلا کی اُلجھن ہوتی تھی۔ لاکھ کہتا کہ اماں اب میں ٹھیک ہوں اب تو آنکھوں کے ڈھیلے بھی نہیں دکھ رہے ہیں۔ اب اُٹھ جانے دیجئے ۔ مگر ہر مرتبہ اماں کا وہی جواب آتا :

اونہوں !

ایسے کڑے وقت کے لیے میں نے بیکاری کا ایک دلچسپ مصرف نکال لیا تھا۔ اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں دے کر بولتا تھا تو مجھے خود اپنی آواز صاف اور اونچی سنائی دیتی تھی۔ اپنے کانوں سے خود اپنی ہی آواز سننا اچھا لگتا تھا۔ میں دیر تک کاتن اور پنکج ملک کے گانے گایا کرتا تھا۔ کبھی کانوں کا ذائقہ بدلنے کے لیے زہرہ بائی انبالے والی کے گانے گنگنا لیتا تھا۔ نسیم بانو کے بھی کئی گانے مجھے اس خوبی سے یاد تھے کہ جس جگہ وہ بے سُری ہوتی تھیں، عین وہیں میں بھی سُر سے اتر جایا کرتا تھا۔ اور تو اور بعض اوقات میں اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں دے کر فلم پکار اور جواب

کے ڈائیلاگ بھی دہرا لیا کرتا تھا۔

مجھے وہ دن بھی یاد ہے جب میں نے خود اپنی ہی آواز سننے کا یہ طریقہ دریافت کیا تھا۔ اس روز یوں ہی ذرا آزمانے کے لیے کسی اچھے سے فقرے کی تلاش میں تھا۔ کانوں میں انگلیاں دے کر میں نے کہا : مجھے قرآن کی ہوا اچھی لگتی ہے۔

یہ جملہ جو میں نے سراسر خود اپنے ہی کانوں کے لیے ادا کیا تھا، خدا جانے کس راستے سے باجی کے کانوں میں جا پڑا۔ وہ لپک کر گئیں۔ مچان سے قرآن اتارا اور میرے سرہانے بیٹھ کر مجھے قرآن کی ہوا دینے لگیں۔ ان کا دل رکھنے کی خاطر مجھے اس وقت یوں بن کر لیٹنا اور کراہنا پڑا جیسے بہت تیز بخار ہو۔

مجھے تو یاد نہیں لیکن باجی بتاتی ہیں کہ ایک روز میں کانوں میں انگلیاں دیئے اول فول بک رہا تھا، ابّا سمجھے کہ ہذیان بک رہا ہوں۔ لپکے ہوئے پہاڑی بازار گئے اور حکیم صاحب کو بلا لائے۔ اُس وقت میں بیکاری کا دوسرا مصرف آزما رہا تھا اور ایک کتاب کے ہر ورق کے کونے پر ناچتی ہوئی عورت کی چھوٹی چھوٹی سینکڑوں تصویریں بنا کر کتاب کے صفحے تیزی سے دوڑا رہا تھا اور سینما کے منظر کی طرح وہ عورت حرکت کرتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

خود اپنی آواز سننے کے اشتیاق میں کون سی ذہنی کیفیت کارفرما ہوتی ہے اس کا علم مجھے اُس وقت بھی نہیں ہوا جب میں کالج میں نفسیات

پڑھ رہا تھا۔ میں نے نفسیات پڑھی، سیاست اور معاشیات بھی پڑھی اور اتنا بہت کچھ پڑھ لکھ کر یہ تیر مار کر کھارادر کے ایک پرائمری اسکول میں پونے دو سو روپے ماہوار پر ٹیچر ہو گیا۔ اپنے دل کو بس یہی کہہ کر سمجھاتا رہا کہ ابھی عمر بہت کم ہے۔ بڑے ہو لیں تو بڑے بنیں گے۔

عمر کا حال یوں تھا کہ اُن ہی دنوں پہلی بار ایک لڑکی اچھی لگی۔ میری طرح وہ بھی کھارادر کی عباسی منزل کے ایک فلیٹ میں رہتی تھی۔ صبح کے وقت اس پانچ منزلہ عمارت کے تاریک زینوں پر اُس سے ملاقات ہوتی تھی۔ ملاقات بھی ایسی کہ میں جس باقاعدگی سے سلام کرتا تھا، وہ اتنی ہی باقاعدگی سے جواب نہیں دیتی تھی۔ میں جس اہتمام سے مسکراتا تھا، وہ اتنے ہی اہتمام سے اپنے دہانے کو اور سکیڑ لیتی تھی۔

میری مہینوں کی ریاضت کے بعد وہ ایک روز مسکرائی تو دل کا یہ حال ہوا کہ اپنے اسکول کو چھٹی کی درخواست بھیجنی پڑی۔ اور جس روز اُس کے ہاتھ سے میرا ہاتھ چھوا، اُس دن تو مجھے گھر میں کمبل اوڑھ کر لیٹنا پڑا۔

ایک روز بڑی ہمت کر کے میں نے اس سے پوچھ ہی لیا کہ مجھ سے شادی کرو گی؟ جو لاکھ روپے کا سوال پوچھنے کے لیے میں نے ہفتوں تنہائی میں مشق کی تھی، اس کا ٹکا سا جواب دینے میں لڑکی ذات نے ایک لمحہ بھی نہیں لگایا۔

اس کے بعد جس رفتار سے اسکول میں میری غیر حاضریاں بڑھیں، اسی

شدت سے اس کی نہیں نہیں بڑھتی گئی۔ مجھے کیا خبر تھی کہ وہ نیچے بازار میں حلوائی کی دکان کے ملازم محمد یوسف سے ہاں کہہ چکی ہے۔

عباسی منزل کے لوکل اخبار کا فرض انجام دینے والی مائی ماجرہ نے جب مجھے اُس کی منگنی کی اطلاع دی اور ایک روپیہ لے کر باقی ضروری اور غیر ضروری تفصیلات بھی بتائیں تو میری آنکھوں کے آگے سینکڑوں چھوٹے چھوٹے سرمئی دائرے اڑنے لگے۔ چہرے پر لگنے والی ہوا خدا جانے کیوں ٹھنڈی سی محسوس ہونے لگی۔ میں اس صدمے کے لیے تیار نہ تھا۔

اسی بقرعید کے مہینے میں شادی طے پائی۔ ایک شام نیچے سڑک پر شامیانے لگے۔ لاؤڈ اسپیکر پر گھسے ہوئے فلمی ریکارڈ بجے، لارنس روڈ سے گدھے گاڑیوں پر لد کر بینڈ باجے والے بھی آئے۔ نکاح ہوا۔ کھانا ہوا۔ اور جس وقت سلطانہ رخصت ہوئی، اس کے باپ اور شامیانے والوں میں یہ جھگڑا ہو رہا تھا کہ ٹوٹنے والی پلیٹوں اور گم ہونے والے چمچوں کے پیسے کون دے گا، لڑکی کا باپ یا لڑکے والے جو اپنے ساتھ کئی درجن بے حد شریر بچوں کو لے کر آئے تھے۔

جب سلطانہ ٹیکسی میں بیٹھ کر یوسف کے ساتھ جا رہی تھی، جب اس کا باپ چلّا رہا تھا کہ چمچوں پلیٹوں کے پیسے لڑکے والوں سے لو، اُس وقت میں دیوار سے ٹیک لگائے اداس کھڑا تھا۔ مجھے یہ بھی ہوش نہ تھا کہ انگلیاں ابھی تک بریانی کے گھی میں سنی ہوئی ہیں اور منہ بھی اچھی طرح صاف نہیں۔ ویسے بھی پانی کی ٹنکیوں پر ہاتھ دھونے والوں کا ہجوم تھا۔

نیچے ٹین کے جس ٹب میں گندا پانی بھر رہا تھا، صابن کے تمام ٹکڑے اس
میں ڈوب چکے تھے اور تولیوں سے مایوس ہو کر لوگ دسترخوان کے کناروں
سے انگلیاں اور جھک جھک کر منہ پونچھ رہے تھے۔

اور میں سب سے الگ تھلگ کھڑا سوچ رہا تھا کہ اگر آج کی رات یوسف
کی جگہ میں ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔

شامیانے کراکری والوں اور سلطانہ کے باپ میں جھگڑا ہوتا رہا اور
میں سر جھکائے سیڑھیاں چڑھتا اپنے فلیٹ میں آگیا اور چادر تان کر سو گیا۔

صبح آنکھ کھلی تو دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ نیچے بازار میں حسب معمول رونق
تھی البتہ مائی حاجرہ خلاف معمول میرے فلیٹ کے دروازے پر دستک دے
رہی تھی۔

"ایک خبر سنو گے؟" دروازہ کھلا بھی نہیں تھا کہ مائی نے شہ سرخی
سُنا دی۔

"رات کو سلطانہ اور یوسف میں زور کی لڑائی ہوئی۔"

"وہ کیوں؟"

میرے اس سوال پر مائی حاجرہ نے کمال کیا اور ایک روپیہ لیے بغیر
باقی ساری تفصیل اگل دی ـــــ "سسرال پہنچتے ہی سلطانہ نے پلیٹوں
اور چمچوں کی بحث چھیڑ دی۔ وہ یوسف سے کہتی تھی کہ باراتیوں کے
بچے شیطان تھے۔ پلیٹیں انہوں نے توڑیں، چمچے انہوں نے چرائے۔ اب
پیسے بھی وہی بھریں۔ یوسف کہتا تھا کہ اس قسم کے سارے ہرجانے لڑکی

والے بھرا کرتے ہیں۔ تمہارے باپ کو ساری کنجوسی اسی موقع پر کیوں سوجھی؟۔
جھگڑا اتنا بڑھا کہ سلطانہ نے اُسی وقت ٹیکسی منگائی اور باپ کے
گھر واپس آگئی، یوسف اور اُس کے باپ نے بھی کہہ دیا کہ جاؤ جاؤ ہمیں
تم جیسی بہو کی ضرورت نہیں۔ اور مل جائیں گی بہتیری۔

"بس بھیا۔ چٹ بیاہ اور پٹ چھٹم چھٹا۔"

یہ کہہ کر مائی حاجرہ آگے بڑھ گئی۔

میں واپس آکر اپنے پلنگ پر لیٹ گیا۔ اپنے کانوں میں انگلیاں دیں
اور آہستہ سے بولا "اچھا ہوا۔"

کھوٹے دادا

یونس کو پندرھواں سال لگ چکا تھا۔ چھوٹے دادا کو انتظار تھا کہ کسی روز ڈاکٹروں کی پیشین گوئی صحیح نکلے اور لڑکے کی زبان کھل جائے۔ وہ جب پیدا ہوا تو عام بچوں کی طرح رویا کرتا تھا۔ ذرا بڑا ہوُا تو غوں غاں بھی کرنے لگا مگر یہ سلسلہ اس سے آگے کبھی نہ بڑھا اور جب سارے گھر والوں نے اسے پیدائشی گونگا قرار دے کر ایک کونے میں ڈال دیا تو یونس نے بالکل ہی چُپ سادھ لی۔

وہ کونوں کھدروں میں بیٹھا اپنے آدھے درجن بھائیوں کے ٹوٹے پھوٹے کھلونوں سے کھیلتا رہتا۔ آتے جاتے بھائی کھلونوں کو ٹھوکر لگا جاتے اور جب کسی کو یونس کی معذوری پر زیادہ طیش آتا تو وہی ٹھوکر اس کی پسلیوں کو لگائی جاتی۔ ایک بار بڑے بھائی نے اسے ٹھوکر ماری تو چھوٹے دادا چلّائے "کیوں مارتا ہے بے—"

"بتاؤں کیوں مارتا ہوں" جواب ملا "جب اسے زور کی لات پڑے گی تو یہ درد سے چلّائے گا اور بولنے لگے گا"

دوسرے بھائی اُسے چھیڑتے "یونس تیری بولتی کیوں بند ہے"

یونس انہیں دیکھتا اور خاموش رہتا۔

رات کے سناٹے میں جب وہ کھلے آسمان کے نیچے لیٹا تاروں کی روشنی میں بڑے پیپل کے ہلتے ہوئے پتوں کو دیکھ دیکھ کر گھڑیاں گزارتا تو چھوٹے دادا اُٹھ کر اس کے قریب آجاتے اور دیر تک بیٹھ کر دنیا زمانے کی باتیں کرتے: سلطانا ڈاکو نے کس طرح ایک بنئے کو لوٹا اور اس کی ساری دولت غریبوں کو دے دی، کانپور میں انگریزوں کو کس طرح قتل کیا گیا، ماسٹر نثار مجنوں کا کردار کیسے ادا کرتے تھے اور گھر میں داستان امیر حمزہ کی جو پرانی کتابیں پڑی تھیں وہ سیلی ہوئی لکڑی جلانے کی خاطر کس طرح پھونک دی گئیں۔

یونس پورے وقت چھوٹے دادا کے چہرے کو تکا کرتا اور جب چھوٹے دادا اُس سے پوچھتے کہ کچھ سمجھ میں بھی آرہا ہے تو وہ نہ گردن ہلاتا، نہ آنکھ کے اشارے سے کچھ کہتا بلکہ دوسری طرف دیکھنے لگتا۔

جس دن چھوٹے دادا نے ڈاکٹر رام پرکاش کی جوان بیٹی کے گھر سے بھاگنے کا قصہ سنایا تو یونس اسی طرح ان کے چہرے کو تکتا رہا اور قصہ ختم ہوجانے کے بعد بھی دیر تک تکتا رہا۔

یونس کے گونگے پن پر سب سے زیادہ خفا اس کی ماں تھی۔ وہ تو اتنی مشتعل ہوجاتی کہ دو دو وقت اسے کھانا نہ دیتی اور کہتی کہ جب تک یہ اپنے منہ سے نہیں مانگے گا میں بھی روٹی نہیں دوں گی۔ ایک دن تو اس کے گلے میں دوپٹے کا پھندا ڈال کر اُسے مارے ڈالتی تھی، وہ تو چھوٹے دادا

اچانک گھر میں داخل ہوئے تو انہوں نے جان بچائی۔

کسی نے کہا کہ لڑکے کو چڑیوں کا جھوٹا پانی پلایا کرو، کیا عجب کہ بولنے لگے۔ چھوٹے دادا پانی کا پیالہ سرِشام منڈیر پر رکھ دیتے کہ صبح ہوگی تو چڑیاں چونچیں ڈبو کر جھوٹا کر جائیں گی مگر ایک نہ ایک بڑا بھائی اس سے پہلے ہی پیالے میں پیشاب کر جاتا۔ چھوٹے دادا سر پیٹ کر رہ جاتے۔

ماں نے ایک بار یونس کے آگے دال رکھی تو اس میں مرچیں جھونک دیں۔ اس کا خیال تھا کہ یونس تکلیف سے چیخے گا اور اشارے سے پانی مانگے گا۔ یونس نے خاموشی سے دال کھالی۔ لڑکوں نے ماں کا مذاق اڑایا اور اسے چڑایا تو وہ بولی: "جس کمبختی مارے کی زبان ہی بیکار ہو اُسے مرچیں کہاں لگیں گی۔ اس کی تو ناک میں مرچوں کی دھونی دینی چاہیئے۔"

ماں تو اپنی بات کہہ کر ادھر ادھر ہو گئی۔ لڑکوں نے کرچھے میں چنگاریاں بھر کر مرچوں کی دھونی اٹھانی شروع کی اور خود ہی کھانستے کھانستے گھر سے باہر بھاگ گئے البتہ چلتے چلتے یونس کے کرتے کے دامن میں چنگاریاں بھر گئے۔

پہلے تو یہ تھا کہ چھوٹے دادا گھر پر ہوتے تو یونس کو اس کے گونگے پن کی سزا ذرا کم ملتی مگر بعد میں یہ تکلف بھی اٹھ گیا اور ایک روز چھ کے چھ بھائی چولہے کی پھکنی کوئلوں پر سرخ کرکے اُسے یونس کے منہ میں رکھنے چلے، ایک نے دست پناہ گرم کرکے اُس سے یونس کی زبان پکڑنے کی کوشش کی اور ایک اور بھائی نے انگاروں پر سنی گرم کی اور اس کی

گردن کے گرد ڈالنے لگا۔

اس روز چھوٹے دادا نے پوتے کی انگلی پکڑی اور گھر سے نکل گئے۔ اب انہوں نے یہی معمول بنا لیا۔ جب کبھی باہر جاتے، یونس کو ساتھ لے جاتے۔ وہ دکانیں، تانگے، بیل گاڑیاں اور مسافروں سے بھری لاریاں دیکھنے میں مصروف رہتا اور دادا کہتے "تیری دکھائی میں اتنی ذہانت ہے تو بولتا کیوں نہیں؟"

ان ہی دنوں ایک عورت پاگل خانے سے فرار ہو کر شہر میں آگئی۔ اس کا بدن کچھ ڈھکا کچھ کھلا، منہ میں پان دبائے، فلمی گانے گاتی وہ گلیوں میں گھومتی اور نوجوان اُسے چھیڑتے اور چھو چھو کر دیکھتے۔

ایک روز چھوٹے دادا نے جو یہ منظر دیکھا تو چھڑی اٹھا کر لڑکوں کو مارنے دوڑے۔ لڑکے دوڑ کر درختوں پر چڑھ گئے اور بندروں کی نقل اتارنے لگے۔ اس وقت چھوٹے دادا کو یوں لگا جیسے انہوں نے یونس کی ہنسی سنی ہے۔ لیکن اپنے بارے میں انہیں یقین تھا کہ ان کے کان اکثر بجتے ہیں۔

پھر برسات آپہنچی اور لڑکے باغ سے آم کے پودے اکھاڑ کر جڑ کی گٹھلی کو پتھروں پر گھس کر ان کے پیپیے بنانے لگے۔ یونس خاموش کھڑا انہیں دیکھتا رہا۔ اور جب لڑکے ننگے ہو کر برساتی نالے میں کودنے لگے اور ان کے دین اور مذہب کا حال کھلا تو چھوٹے دادا کو وہی ذرا سی ہنسی سنائی دینے کا گمان ہوا۔

بادل جب ٹوٹ کر برسنے لگے اور آس پاس کے دیہات سے تباہی کی خبریں آنے لگیں تو اُسی کے ساتھ نہر کا پانی بھی چڑھنا شروع ہُوا اور رات کے دوران پانی کی سطح خطرے کے نشان کو چھونے لگی۔ صبح ہوتے ہی شہر والے پُل کی طرف چل پڑے۔ یہ ہر سال کا معمول تھا۔ نہر میں طغیانی آتی تھی تو اس میں بہتے ہوئے نہ صرف چھپّر اور مویشی آتے تھے بلکہ کبھی کبھار لاشیں بھی آجاتی تھیں۔ اُس وقت پل پر کھڑے ہوئے مجمع میں سنسنی پھیل جاتی تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایک بار بہتی ہوئی ایک چارپائی آئی تھی جس پر لیٹا ہُوا دودھ پیتا بچہ انگوٹھا چُوس رہا تھا اور اس کی کلائی میں کالا ڈورا بندھا ہُوا تھا۔ مگر جو سب سے دلچسپ روایت تھی وہ یہ کہ بہنے والا اگر مرد ہوتا تھا تو اُس کی لاش چت ہوتی تھی اور عورتوں کی لاشیں پیٹ کے بل بہا کرتی تھیں۔ چھوٹے دادا جیسے سارے بڑے بوڑھے کہا کرتے تھے کہ اللہ ان کی لاج رکھتا ہے۔

اُس روز عجیب قصہ ہوا۔ کسی عورت کی بہتی ہوئی لاش آئی اور پُل کے ستون میں اٹک گئی۔ اس کا لباس تار تار ہو چکا تھا اور گوری پیٹھ صاف نظر آ رہی تھی جس پر سے گدلے پانی کی لہر گزرتی تو اس کی رنگت مٹیالی ہو جاتی۔ شہر کے سارے نوجوان وہاں آ گئے جہاں سے لاش صاف نظر آتی تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ کوئی تھپیڑا آئے گا اور اللہ لاش کو اور اس سے بڑھ کر اُس کی لاج کو کہیں اور لے جائے گا۔

جب پانی کی سطح پر پھیلے ہوئے اس کے بالوں کو ہلکورے لیتے کئی گھنٹے

گزر گئے تو بستی کے نوجوان کہیں سے بڑے بڑے بانس لے آئے۔ انہوں نے بانس نہر میں ڈالے اور عورت کی لاش کو پلٹ کر چت کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ کچھ نوجوان ایک طرف سے لاش کو روکتے اور دوسرے لڑکے پہلو میں بانس ڈال کر لاش کو الٹنے کی کوشش کرتے۔

یہ تماشا جاری تھا اور چھوٹے دادا کی گرم گرم سانسیں یونس کی گردن پر مسلسل ایک ہی جگہ ٹکرائے جا رہی تھیں کہ اچانک یونس نے پلٹ کر دادا کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی اور وہ بولا: "چھوٹے دادا۔ بڑا مزہ آ رہا ہے۔"

مہر جو اُس کی ہووے

دنیا میں ایسے مزدور بہت کم ہوں گے جنھیں مزدوری کرنے میں
لطف آتا ہو، مگر اُسے آتا تھا۔ اس کا ایک سبب شاید یہ بھی ہو کہ ماں
باپ نے اُس کا نام لطف اللہ رکھا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ سارے راج
مزدور اسے لُت فُلّا کہتے تھے۔

وہ منظر بھی قابلِ دید ہوتا تھا جب لطف اللہ جھوم جھوم کر سیمنٹ کی
بوریاں اٹھاتا، منہ سے سیٹی بجا بجا کر تسلے میں کنکریٹ بھرتا یا اوپر چڑھانے
کے لیے مچان پر اپنے ساتھیوں کی جانب اینٹیں اچھالتا اور گاتا جاتا۔

مہر جو اس کی ہووے تو کوئی مورو مارنے ڈرے نہیں
چینٹی پہ ہاتھی چڑھ بیٹھے تو وہ چینٹی مرے نہیں

وہ گاتے گاتے کمان کی طرح جھکتا، اینٹ اٹھاتا اور اُسے یوں
اچھالتا کہ وہ سیدھی دوسرے مزدور کے ہاتھوں میں جاتی۔ پھر ہوتا یہ کہ
اینٹوں کا تانتا بندھ جاتا۔ لطف اللہ کو ہر مرتبہ اوپر دیکھنے کی ضرورت بھی
نہ ہوتی۔ وہ جھکے جھکے ہی اینٹ اچھالتا اور کیا مجال کہ اینٹ اپنے نشانے
پر نہ جائے۔ مچان پر چڑھا ہوا مزدور آواز لگاتا "واہ لُت فُلّا۔ کیا تاک کر

اینٹ پھینکتے ہو۔ کسی دنگے فساد میں سو گئے پھینکو تو سو سر پھٹیں۔"
اپنی تعریف سن کر لطف اللہ فخر سے سینہ تو نہ پھلاتا البتہ ایک بار
دونوں ہتھیلیوں کو یوں پھیلاتا جیسے دعا مانگ رہا ہو اور ان کی سخت اور
کھردری جلد پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال کر دوبارہ اینٹیں اچھالنے میں جُٹ جاتا
اور عمارت کی ادھوری دیواروں میں اس کی سُریلی آواز گونجنے لگتی۔

مہر جو اس کی ہووے تو کوئی مورو مارنے ڈرے نہیں

وہ ایسے لہک کر گاتا کہ پلاسٹر پر پانی چھڑکتے ہوئے مزدور اس کا گانا سننے
کی خاطر چھڑکاؤ بند کر دیتے۔

مگر پھر ہوا یہ کہ یہ سب باتیں پرانی ہو گئیں۔ شہر میں نئے مکان بننے
بند ہو گئے۔ مزدور بے روزگار ہو گئے اور یہ بے روزگاری اتنے روز چلی کہ ایک
دن لطف اللہ نے دُعا مانگنے کے لیے ہاتھ اٹھائے تو دیکھا کہ ہتھیلیوں کی
جلد ملائم اور چکنی ہو چلی ہے۔

وہ روز صبح ٹھیکے داروں کے ٹھکانوں کے چکر کاٹتا اور مزدوروں
کے ٹھیوں پر جا کر بیٹھتا۔ مکان تو کیا، کوئی شخص منڈیر بنوانے بھی نہ آتا۔
لطف اللہ شام کو سر جھکائے گھر میں داخل ہوتا۔ اب تو بیوی نے یہ پوچھنا
بھی چھوڑ دیا کہ کام ملا یا نہیں۔ وہ دونوں دیر تک باتیں کرتے کہ شہر والوں
کو کیا ہو گیا کہ مکان نہیں بنواتے۔ ٹھیک ہے۔ نہ بنوائیں خود ہی کھنڈروں
میں رہیں گے ـــــــ اور وہ سسُرے کہتے کہتے رہ جاتا۔ کیا خبر جنھیں آج
وہ سسُرے کہے کل کلاں جا کر انھیں کا مکان بنانا پڑے۔

اور پھر یہ ہوا کہ ایک صبح وہ گھڑی آن پہنچی۔ جان محمد نے دروازے پر آکر خبر سنائی "لے پھر خوش ہو جا۔ کل تجھ آ ہے۔ نئی کوٹھی شروع ہو رہی ہے۔ ٹھیکیدار نے مزدور منگائے ہیں۔ وہ ادھر تکیے کے پچھواڑے اونچائی پر پولیس چوکی ہے نا؟ اس کی ڈھلان پہ کل نیو کھدے گی۔ کدال لے کر آ جائیو۔ چھت پڑنے تک تیرا کام ہے۔ اور تیرا لونڈا کیسا ہے۔ کتنا بڑا ہوا۔ تیری طرح گاوے ہے کہ نہیں؟۔۔۔۔"

لطف اللہ اور جان محمد کا مصافحہ طویل ہوتا چلا گیا اور جوں ہی گفتگو ختم ہوئی اور ہاتھ چھوٹے، لطف اللہ نے اندر سے کواڑ کی کنڈی چڑھائی، آنکھیں موندیں۔ ایک ہاتھ کا پیالہ سا بنا کر دائیں کان پر رکھا۔ گردن کی رگیں پھولیں اور وہ بہت اونچے سروں میں گانے لگا۔

مہر چرا اس کی ہو وے تو کوئی مور و مار سے ڈرے نہیں

اُس رات خوشی کے مارے بیوی کو نیند نہیں آئی، بیٹا بھی دیر تک جاگا اور خود لطف اللہ کو یوں لگا جیسے وہ پرانی کھاٹ پر نہیں نئے نوٹ پر سو رہا ہو۔

صبح ہوتے ہی لطف اللہ نے کدال اٹھائی اور پولیس چوکی کی طرف چل پڑا۔ بیٹا بہت دور تک ساتھ چلا اور وہ بھی اچھلتا کودتا۔

باپ اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے لوٹ آیا تو بیٹے نے خوشی سے ناچنا شروع کر دیا۔ لطف اللہ نے کہا "ابے ناچتا ہے۔ ابے گا یا کر۔ میری طرح۔"

بیٹے نے اوہوں کہتے کہتے اتنی زور سے گردن گھمائی کہ خود بھی ایک

ایڑی پہ گھوم گیا اور دوبارہ ناچنے لگا۔ ماں نے اُسے ٹوکا "کم بخت۔ ذرا خراب ناچ۔ محلے والوں کی نظر لگ جائے گی۔"

اور پھر جب تک چراغ روشن رہے، یہ چھوٹا سا گھرانہ جگمگاتا رہا۔

لطف اللہ ہر روز کام پر جاتا۔ ہر شام گھر میں خوشیاں بھر جاتیں۔ بیوی سر پہ نیا دوپٹہ ڈالتی۔ بیٹا نئی چپل پہن کر اتراتا اور ابلی ہوئی دال میں اب گھی بھی لگتا۔

پولیس چوکی کی ڈھلان پر نئی کوٹھی کی عمارت اونچی ہونے لگی۔ وہاں سے برف خانے، سوالی ندی کے پُل پار کے جنگلوں اور دور کے پہاڑوں کا نظارہ اتنا دل کش تھا کہ ٹھیکیدار بھی اپنا رعب داب بھول کر لطف اللہ سے فرمائش کرنے لگا "گت فلاں۔ ذرا وہ ہاتھی اور چیونٹی والا گانا سنا دے۔"

پھر رات کو بیٹا اس کا دماغ چاٹتا "دیواریں کتنی اونچی ہوئیں؟ کھڑکیاں لگیں یا نہیں؟ چھت کتنے دن بعد پڑے گی؟ فرش کب بنے گا اور کون بنائے گا؟"

جب تک کوٹھی کی دیواریں نیچی رہیں، لطف اللہ کا سُر اونچا رہا۔ آخر بات چھت کے قریب جا پہنچی اور لطف اللہ کا گانا مدھم ہوتے ہوتے بند ہو گیا۔ جس روز چھت ڈالنے کے لیے لوہے کے سریوں کا جال بچھایا گیا اس نے بیوی کو بلا سبب ڈانٹا اور بیٹے نے ذرا سی بات پر بڑا سا تھپڑ کھایا۔

لطف اللہ دو چار لقمے حلق سے اتارتا، گھسے ہوئے پُرانے جوتے

اپنے پیروں سے کھاٹ کے نیچے سرکاتا اور لیٹتے ہی سوجاتا یا شاید آنکھیں موند موند کر گہری سانسیں لینے لگتا تاکہ بیٹا یہ نہ پوچھے کہ چھت کب پڑے گی۔

ان ہی دنوں بادل گھر کر آنے لگے۔ ہر ایک کو فکر ہوئی کہ چھت پڑنے سے پہلے کہیں برس نہ پڑیں۔ ایک تو سیمنٹ خراب ہوگی۔ دوسرے کام بند ہو جائے گا اور ساتھ ہی روزی بھی۔

لطف اللہ نے اپنے بیٹے سے کہا: "کیا ناچتا پھرتا ہے۔ اللہ میاں سے دعا مانگ کہ بارش نہ ہو۔"

بیٹے نے باپ کی طرح ہاتھ اٹھائے البتہ ہتھیلیوں کی جلد کو دیکھے بغیر ہی چپکے چپکے دعا مانگنے لگا۔ اس میں کہیں کہیں کوٹھی، بارش، چھت اور دوسری چپل کے لفظ سنائی دیئے۔

لطف اللہ نے مسکرا کر کروٹ بدلی اور سو گیا۔

اگلے روز چھت پڑ گئی اور اُسے آخری دہاڑی دے کر رخصت کر دیا گیا۔

اب جو وہ گھر کی طرف چلا تو وہی روز کا راستہ لمبا ہونے لگا۔ بڑی دیر بعد نہر آئی۔ خدا خدا کر کے نہر کا پل آیا۔ بہت چلا تو اشنان گھاٹ تک پہنچا۔ ٹانگیں دکھنے لگیں تو رام لیلا کا میدان آیا اور کٹیا پاٹھ شالا تک پہنچتے پہنچتے اس کا سارا بدن شل ہو گیا۔ گھبرا کر اس نے گنگنانا چاہا لیکن فوراً ہی چپ ہو گیا۔ وہ گانے کی طرز بھول رہا تھا۔ اس نے دوبارہ شروع کیا لیکن جھٹ اپنی آواز نیچی کر لی۔ آج اس نے کارخانے کے آگے رک کر بنولے کے تیل اور کھلی کو الگ ہوتے بھی نہیں دیکھا۔ ذرا آگے آج بھی بوڑھے ڈاکٹر

کی بوتلوں میں ادرک کا پانی بھرا جا رہا تھا مگر وہ نہ تو اُسے دیکھنے کے لیے ٹھہرا نہ اُس نے یہ سوچا کہ بوتلوں کی گردن کے اندر یہ شیشے کی گولی کب اور کیسے ڈالی جاتی ہوگی۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد گنگنا کر دیکھتا اور ہر بار اس کے گانے کی طرز پہلے سے زیادہ بھونڈی ہوتی۔ آخر وہ خاموش ہو کر چلنے لگا۔ اسے خود اپنی سانسیں سنائی دینے لگیں۔

صدیوں چلا تو گھر آیا۔ جیسے پہاڑ گرتا ہے ویسے چارپائی پر گرا سیمنٹ میں اٹے ہوئے پرانے جوتے چارپائی کے نیچے بھی نہیں سرکائے اور رانوں میں دھنس گیا۔ ایڑیاں اور رانوں میں اُلجھنے لگیں تو اس نے پاؤں سکیڑ لیے۔ بیوی خاموشی سے سرہانے بیٹھی اور اس کا سر دبانے لگی۔ اسے پتہ تھا کہ کل سے دال میں بگھار نہیں لگے گا۔

اتنے میں دھڑام سے گھر کا دروازہ کھلا اور بیٹے نے اندر آتے ہی صدا لگائی "چھت پڑ گئی کیا ہے"

خوشی سے اس کا چہرہ دمک رہا تھا: "ابا جی چھت پڑ گئی کیا ہے ــــــ"

اور اس کا یہ سوال تیسری بار پوچھنا غضب ہو گیا۔ لطف اللہ تلملا کر اٹھا۔ کمان کی طرح جھکا۔ اپنا ایک جوتا یوں اٹھایا جیسے اینٹ اٹھائی ہو، اور پھر اُسے تاک کر بیٹے کے منہ کی طرف پھینکا۔ سیمنٹ میں اٹا ہوا بھاری بھرکم جوتا ہوا کو کاٹتا ہوا گیا۔

زندگی میں پہلی بار اُس کا نشانہ خطا ہوا۔

غصے سے یا شاید ندامت سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ ایک ہاتھ

کی مٹھی بھینچ کر اپنی ہی ران پر گھونسے برسانے لگا۔

بیٹے نے، جو حیرت سے آنکھیں پھاڑے یہ منظر دیکھ رہا تھا، خاموشی سے وہ جوتا اٹھایا۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا باپ کے قریب گیا اور جوتا اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا "ابا جی، تم نے تو ٹھیک مارا تھا مگر تم کانا تو بھول ہی گئے۔ پھر سے مارو۔ ضرور لگے گا"

ایک جیبی گھڑی

اگر آپ چھاؤنی سے شہر کی طرف آئیں اور نہر کا پُل پار کر کے بڑے بازار میں پہنچیں تو آپ کے سیدھے ہاتھ پر صابری ہوٹل کے برابر دارالعلوم سیفیہ والی گلی کے کونے پر رحیم گھڑی ساز کی دکان ہے۔

یہ دکان ان کے والد نے کھولی تھی۔ وہ تو شاید دوسری عالمی جنگ کے بعد مر کھپ گئے، ان کے بعد یہ کام عبدالرحیم نے سنبھالا اور بڑی مستعدی سے سنبھالا کیونکہ لوگوں نے انہیں جب بھی دیکھا، ایک ٹیبل لیمپ کی روشنی میں کسی چھوٹی سی گھڑی پر جھکے ہوئے ہی دیکھا۔ ان کی ایک آنکھ پر گھڑی سازوں والا لینس اتنی باقاعدگی سے لگا رہتا تھا کہ اس کے بغیر انہیں پہچاننے میں دشواری ہوتی تھی۔

عبدالرحیم صرف مرمّت کیا کرتے تھے، گھڑیوں کی فروخت کا کاروبار انہوں نے ختم کر دیا تھا البتہ ان کے والد کے زمانے میں دکان میں چھوٹی بڑی گھڑیاں بھی ملتی تھیں بلکہ آخری دنوں میں وہ کلکتے گئے تھے تو وہاں سے جاپان کی بنی ہوئی بہت سی جیبی گھڑیاں خرید لائے تھے۔

جن دنوں کی یہ کہانی ہے اس وقت تک دکان میں بزرگوار کے وقت

کی صرف ایک گھڑی بچی تھی۔ دکان میں آگے کی طرف ایک پرانا شوکیس رکھا تھا، اُس کے اندر اتنا ہی پرانا اخبار بچھا ہوا تھا جس پر کبھی جیبی گھڑیاں آراستہ کی گئی ہوں گی۔ دھوپ نے اخبار کا کاغذ زرد کر دیا تھا البتہ اُس پر رکھی جانے والی گھڑیوں کے سائے کے نشان ابھی باقی تھے اور اتنے بڑے شوکیس کے اندر صرف ایک گھڑی بچی تھی۔ ایک جیبی گھڑی۔

کسی کو نہیں پتہ کہ اس ایک گھڑی کی خاطر عبدالرحیم اتنا بڑا شوکیس روز دکان بند کرتے وقت اٹھا کر اندر، اور اگلی صبح دکان کھولتے ہوئے اندر سے اٹھا کر باہر کیوں رکھا کرتے تھے۔ شاید یہ شوکیس بھی ان کی آنکھ پہ لگے ہوئے لینس کی طرح تھا، اگر اسے ہٹا لیا جاتا تو دکان کو پہچاننے میں دقت ہوتی۔

جاڑا شروع ہو گیا تھا اور بازار میں گاؤں کا گھی، گڑ، رساول اور چھوٹے ملائم گنّے بیچنے والوں کا ہجوم لگا رہتا تھا۔ ایک روز اسی ہجوم کو پار کر کے ڈاکٹر تیرتھ رام عبدالرحیم کی دکان پر پہنچے۔ بڑے تپاک سے ایک دوسرے کی مزاج پُرسی کی گئی اور یہ جانتے ہوئے کہ سامنے شوکیس میں ایک جیبی گھڑی سجی ہے، ڈاکٹر صاحب نے پوچھا "عبدالرحیم تمہارے پاس کوئی جیبی گھڑی ہے؟"

عبدالرحیم نے وہیں کرسی پر بیٹھے بیٹھے زیرِ مرمت گھڑی پر جھکے جھکے، ایک آنکھ پر لینس لگائے لگائے ایک چھوٹے سے پیچ کش کی نوک سے شوکیس کی طرف اشارہ کیا اور کہا — "بس یہ ایک گھڑی رہ گئی ہے، لے جایئے۔"

ڈاکٹر صاحب نے گھڑی ہاتھ میں لے کر اُلٹ پلٹ کر دیکھی اور بولے۔ "کتنے پیسے لو گے اس کے؟"

عبدالرحیم نے کہا "ڈاکٹر صاحب، جو مرضی آئے دے دیجئے۔"

مگر ایسا ہوا نہیں — عبدالرحیم نے آٹھ روپے مانگے، ڈاکٹر صاحب نے سات دیئے اور خریدنے کے بعد گھڑی کو دوبارہ دیکھا اور جیب میں ڈال کر رخصت ہوئے۔

یہ جاپانی گھڑی دیکھنے میں اچھی بھلی تھی لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس میں ایک عجیب سی بات محسوس کی۔ ان کے ہاتھ میں آتے ہی گھڑی کی چال بدل گئی۔ جو رفتار مریض کی نبض کی ہوتی تھی، گھڑی میں سیکنڈ کی سوئی کی بھی وہی رفتار ہو جاتی۔ دو روز تو انہوں نے گھڑی کو آزمایا، تیسری صبح وہ گھڑی لے کر عبدالرحیم کی دکان پر پہنچے اور سارا احوال کہہ سنایا۔ عبدالرحیم نے گھڑی ہاتھ میں لے کر اسے اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور خاموشی سے سات روپے نکال کر ڈاکٹر تیرتھ رام کے ہاتھ میں رکھ دیئے۔ انہوں نے وہیں سامنے سے چار آنے کی گرم مونگ پھلیاں اور چار آنے کے تل کے لڈّو خریدے اور باقی ساڑھے چھ روپے جیب میں رکھ کر چلے گئے۔

ابھی وہ دارالعلوم سیفیہ کی گلی میں مُڑے ہی ہوں گے کہ جولاہوں کی برادری کے بزرگ بابو محمد شفیع دکان پر آ پہنچے۔ پیٹھ پیچھے لوگ انہیں گانٹھے بابو کہتے تھے مگر سامنے بڑے ادب سے بابو جی کہا کرتے تھے۔

"بابو جی، کہیئے کیسے آنا ہوا؟" عبدالرحیم لہک کر بولے۔

"ارے میاں۔ عبدالمجید صاحب کے زمانے میں بڑا آرام تھا۔ اُس زمانے میں اچھی اچھی گھڑی اس دکان پر مل جایا کرے تھی۔ اب تو خالی پڑی ہے تمہاری دکان۔"

"بابوجی، آپ کو کیا چاہیئے۔"

"ارے میاں، کیا کہیں ہیں اُسے، ایک جیبی گھڑی۔"

اس بار عبدالرحیم نے سات روپے مانگے اور بابو محمد شفیع نے اپنی گاڑھی کمائی سے اتنے ہی دے دیئے لیکن تیسری ہی صبح اُس نے دیکھا کہ بابوجی دوبارہ چلے آرہے ہیں۔

"عبدالرحیم۔ میاں عجیب گھڑی ہے تمہاری۔ جب بھی نکال کے دیکھوں ہوں سُسری کو، اس کی چال کھڈی کی چال پکڑ لیوے ہے۔ کھڈی تیز چلے ہے تو یہ بھی تیز چلے ہے، وہ بند ہو جائے ہے تو یہ بھی رک جائے ہے، یہ کیسی گھڑی ہے میاں، کیا نام ہے تمہارا؟——"

عبدالرحیم نے خاموشی سے سات روپے نکالے اور دل میں یہ کہتے ہوئے بابوجی کے ہاتھ میں تھما دیئے کہ گاڑھوں کے گھر جا کر گھڑی بھی گاڑھی ہو گئی۔

بابوجی نے سامنے بازار سے تھوڑا سا تِل پُھگّا اور کچھ گُڑ کی گزک خریدی اور چلے گئے۔ عبدالرحیم نے شوکیس کھولا اور دھوپ کے پرانے نشان کے عین اُوپر گھڑی کو دوبارہ آراستہ کر ہی رہے تھے کہ نگاہ فوجی بوٹوں پر گئی۔ انہوں نے آنکھ سے لینس ہٹا کر دیکھا تو سامنے حوالدار بھٹناگر کھڑے تھے۔

عبدالرحیم گھبرا کر کھڑے ہو گئے اور ادھر اُدھر یوں دیکھنے لگے جیسے حوالدار صاحب کو پیش کرنے کے لیے خالی کرسی ڈھونڈ رہے ہوں۔

اس بار گھڑی کا سودا صرف چھ روپے میں ہوا۔ حوالدار بھٹناگر گھڑی سے بہت خوش تھے کیونکہ ان کے والد صاحب کے زمانے کی چاندی کی زنجیر گھر میں پہلے سے موجود تھی اور انہیں یقین تھا کہ اُس میں یہ جیبی گھڑی خوب سجے گی۔

انہوں نے گھڑی جیب میں ڈالی اور باہر سے جیب کو تھپتھپایا۔ ڈیل کہا۔ عبدالرحیم کو آنکھ ماری اور بالکل عبدالرحیم کی کم سنی کے زمانے کے کرنل فرینک کی طرح چلتے ہوئے چھاؤنی کو لوٹ گئے۔

عبدالرحیم نے یہ سوچتے ہوئے کہ اِس مرتبہ گھڑی کون سی چال چلے گی، حوالدار صاحب کے دیئے ہوئے چھ روپے اپنی میز کی دراز میں صندوقچی کے اندر نہیں رکھے بلکہ اخبار کے نیچے دبا دیئے تاکہ کل کلاں کو واپس کرنے میں آسانی ہو۔

لیکن کل کلاں کی نوبت نہیں آئی۔ شام کو جب عبدالرحیم کی دکان کے آگے کھڑا ہوا چورن والا اپنے چورن پر سفید سا پاؤڈر چھڑک کر اور تیزاب کا قطرہ ٹپکا کر اس میں سے شعلے اُٹھا رہا تھا اور راہ گیروں کا مجمع کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا، حوالدار بھٹناگر آ پہنچے۔ "عبدالرحیم، یہ کیسی گھڑی ہے؟"

"کیا ہوا سرکار؟" عبدالرحیم نے میز کی دراز ذرا سی کھول کر اخبار کے نیچے نوٹ ٹٹولتے ہوئے کہا۔ "کیا بات ہے سرکار؟"

"اس کی عجیب چال ہے۔ ارے بھئی یہ تو پریڈ کی چال چلتی ہے۔ فوجی پریڈ ہوتی ہے نا؟ تو فوجی بوٹوں کی آواز کے ساتھ اس کی سیکنڈ کی سوئی اپنی چال بدل دیتی ہے۔"

حوالدار صاحب نے چھ روپے اپنی جیب میں رکھے۔ جیب کو تھپکی دی اور بازار سے کچھ خریدے بغیر چلے گئے۔

اسی طرح سردیاں گزر گئیں۔

ایک رات زور کی بارش ہوئی اور اگلی صبح بازار میں کیریاں آٹھ آنے ڈھیری کے حساب سے بکنے لگیں۔ اُس صبح عبدالرحیم دکان میں بیٹھے بُری طرح کھانس رہے تھے کہ سامنے ایک تانگہ آ کر رکا۔ اس میں دو دیہاتیوں کے ساتھ دارالعلوم سیفیہ کے ملّا جمال بیٹھے تھے۔

ملّا جمال کی علاقے میں بڑی دھاک تھی۔ ایک بار کسی سے خفا ہوئے تو اعلان کر دیا کہ اُس کی نماز جنازہ نہیں پڑھاؤں گا۔ اُس غریب نے آ کر قدموں میں سر رکھ دیا۔ ایک مرتبہ ناراض ہو کر کسی کا نکاح فسخ کیے دے رہے تھے۔ کچھ پڑھے لکھے لوگوں نے بیچ بچاؤ کر کے معاملہ رفع دفع کرایا۔

ملّا جمال تانگے سے اترے اور کیریوں کی ڈھیریاں پھلانگتے ہوئے عبدالرحیم کی طرف بڑھے۔ مچھلی محلے کے بنگالی مچھیرے ادھر سے گزر رہے تھے۔ انہوں نے ملّا جی کے ہاتھ چومے اور تعویذوں کے وعدے لیتے ہوئے نہر کی طرف چلے گئے اور ملّا جمال دکان پر جا پہنچے۔

عبدالرحیم بولے "آؤ ملّا جی۔ کہو کس طرح آنا ہوا؟"

"ایسا ہے میاں عبدالرحیم۔" نہایت منجھی ہوئی زبان میں جواب ملا۔ "ہمارے نانا میاں مرحوم و مغفور کی ایک جیبی گھڑی تھی ہمارے کنے۔ وہ کہیں ایسی لاپتہ ہوئی ہے کہ سارے شاگرد ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہلکان ہو گئے۔ نہیں ملی۔ اب ہم گھڑی کے بغیر اپنے معمولات کی پابندی نہیں کر سکتے۔ اس وقت تقریر کرنے آصف نگر جا رہے ہیں۔ دوپہر کا کھانا بھی گاؤں والے کر رہے ہیں۔ سو چا راستے میں دیکھ لیں۔ تمہارے پاس کوئی اچھی سی گھڑی ہو تو دے دو اور دیکھو، ذرا ٹھیک دام لگا لو۔"

عبدالرحیم نے لپک کر شوکیس کھولا۔ "یہ لو ملّا۔ بہت عمدہ گھڑی ہے۔ آدمی دیکھ کر چلتی ہے۔ تمہارے پاس رہے گی تو دن میں پانچ مرتبہ کوکے گی۔"

"اور اگر ٹھیک نہ چلی؟"

"تو دام واپس۔"

ملّا جمال نے مطمئن ہو کر گھڑی جیب میں رکھ لی اور عبدالرحیم کو حیرت سے دیکھا کہ دس بارہ روپے کی گھڑی اُس نے پانچ روپے میں کیوں دے دی اور کیریوں کے ڈھیر کو پھلانگ کر واپس تانگے میں جا بیٹھے۔

عبدالرحیم نے گھر میں اچار ڈالنے کے لیے اُسی وقت تین روپے کی کیریاں خرید لیں اور باقی دو روپے کے مسالوں کی فہرست بنانے لگے۔

ملّا جمال آصف نگر پہنچے تو دیکھا کہ جھال کے قریب نہر کے کنارے شامیانے لگے ہیں اور دوپہر کا کھانا پک رہا ہے۔ سہ پہر تک علاقے کے سارے

کسان تقریر سننے کے لیے جمع ہو گئے۔ ملّا دیر تک انہیں سمجھاتے رہے کہ جو کوئی یہاں ایک مسجد بنائے گا اُسے آخرت میں اتنی زمین ملے گی کہ صبح گھوڑے پر بیٹھ کر سارا دن اُس کا چکّر لگائے گا تب بھی زمین ختم نہیں ہوگی۔

تقریر کرکے واپس تانگے میں بیٹھنے جا رہے تھے کہ دو لڑکوں نے آواز لگائی کہ ملّا جی۔ جو کوئی یہاں غریبوں کے لیے اسکول اور ناداروں کے لیے شفاخانہ بنائے گا اُسے آخرت میں کیا ملے گا۔ ملّا جمال چھڑی اٹھا کر لڑکوں کی طرف دوڑے۔ وہ تو گنّے کے کھیت میں گھس گئے اور ملّا جمال کا ایک جوتا کیچڑ میں دھنس گیا۔ کسانوں نے لپک کر جوتا نکالا اور نہر میں دھو کر اور اپنی پگڑیوں سے خشک کرکے تانگے میں بیٹھے ہوئے ملّا جی کو اپنے ہاتھوں سے پہنایا۔

تانگہ چلا تو ملّا جمال نے اپنی نہایت گہری جیب میں اندر تک ہاتھ ڈال کر گھڑی نکالی اور ہتھیلی اور انگلیوں کے پیالے میں اُسے سجا کر مسرور ہو کر دیکھا —— پھر غور سے دیکھا اور دیکھتے رہے۔

گھڑی پیچھے کی طرف چل رہی تھی۔

راستے میں عبدالرحیم کی دکان آئی اور نکل گئی۔

دل ہی دل میں

مچھلی کے شکار کا جیسا شوق مجھے ہے، شاید ہی کسی کو ہو۔ شکار کو جاتا ہوں تو اس اہتمام سے کہ ساتھ میں اچھا سا پائپ اور بہت سا تمباکو، ٹائم اور نیوز ویک کے تازہ شمارے، صبح کا بھاری بھرکم اخبار، کوئی دلچسپ کتاب، چھوٹا سا جیبی ریڈیو، وہ فیلٹ ہیٹ جس پر ننھا سا پر لگا ہوا ہے اور جسے میرے دوست سرخاب کا پر کہتے ہیں، اس کے علاوہ پلاسٹک کی تھیلی میں بھرے ہوئے تازہ نمک پارے اور تھرمس میں بھری ہوئی گرم چائے، نہایت آرام دہ فولڈنگ کرسی اور ویسی ہی فولڈنگ میز۔

یہ سارا ساز و سامان بڑی شان سے میرے ساتھ جاتا ہے البتہ جو چیزیں جاتی نہیں، بس مجبوراً لے جائی جاتی ہیں، ان کی فہرست بھی چھوٹی سی ہے: چھڑی، ڈورا اور کانٹے۔

میرے دوست اکثر کہا کرتے ہیں کہ تم مچھلیاں پکڑنے نہیں جاتے، اُن پر احسان کرنے جاتے ہو۔

شاید یہ بات مچھلیاں بھی جانتی ہیں۔ میری نظروں کے سامنے تیرتی

رہتی ہیں۔ اِدھر اُدھر تیرتی پھرتی ہیں مگر کیا مجال جو کبھی میری ڈور اور کانٹے کے قریب بھی پھٹکیں۔

میں بھی انہیں خاطر میں نہیں لاتا۔ غرض ہوگی تو خود ہی پھنسیں گی۔ مجھے ان سے کہیں زیادہ فکر نکاراگوا کے باغیوں، جنوبی سوڈان کے عیسائیوں اور کمبوڈیا کے چھاپہ ماروں کی ہوتی ہے۔ نہر کی مچھلی سے کہیں بڑا مسئلہ مشرقی جرمنی کا ہے جہاں خدا جانے اشتراکیت کا کیا حشر ہوگا۔

کبھی کبھار چہرے کے سامنے سے اخبار ہٹا کر ڈور پر نگاہ ڈال لیتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ مچھلی پھنس گئی تو اخبار رسالے کدھر اچھالوں گا، پائپ کہاں ڈالوں گا اور چائے سے بھرے تھرمس کے ڈھکن کو کیسے سنبھالوں گا۔ ان ساری زحمتوں سے جی بہت گھبراتا ہے۔ مچھلی کا شکار نہ ہوا وبالِ جان ہوگیا۔ یہ سوچتا ہوں اور دوبارہ خبروں کے طلاطم میں غوطہ زن ہو جاتا ہوں، کسی تشویش زدہ فکرمند مچھلی کی طرح۔

کبھی کبھی ایک خیال ایسا آتا ہے کہ بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے، ایسی کشادہ ہنسی کہ منہ سے پائپ نکالنا پڑتا ہے۔ سوچتا ہوں کہ جس طرح مجھے دنیا کے حال کی اطلاع ہے، مچھلیوں کو میرے دل کے حال کی خبر ہے۔ اس بات کا خاص خیال رکھتی ہیں کہ میرے کانٹے کو ٹھیس نہ لگ جائے۔

اُس روز جب افغانستان کی لڑائی کا احوال پوری طرح پڑھ لیا اور اس جنگ میں امریکہ اور روس کی حکمتِ عملی کو اچھی طرح سمجھ لیا تو چہرے کے سامنے سے اخبار ہٹایا، ڈور پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اُسے ساکت

دیکھ کر دل میں مچھلیوں کا شکر ادا کیا اور قریب تھا کہ چین کی قیادت کے اندازِ فکر پر تازہ مقالہ پڑھنا شروع کروں، عین اُسی وقت نہر کے دوسرے کنارے پر ایک لڑکا نظر آیا۔ دس سال کا ہوگا یا شاید گیارہ کا۔ ملگجے کپڑے آستینوں کے بٹن ٹوٹے ہوئے، بکھرے ہوئے بال مگر روشن چہرہ۔ اُسے دیکھ کر حیرت ہوئی کیونکہ چھٹی والے دن وہاں اتنے سویرے کوئی نہیں آتا۔

وہ ٹین کے خالی ڈبے کو ٹھوکریں مارتا اور وہاں تیرنے والی اکیلی بطخ کے آگے فرضی روٹی کے جھوٹ موٹ ٹکڑے ڈالتا نہر کے کنارے اونچی دیوار کے قریب پہنچا۔ وہیں پڑا ہوا ایک کوئلہ اٹھایا اور دیوار پر بہت بنا سنوار کر شاید اپنا ہی نام لکھا: مدبر

میں نے دل ہی دل میں کہا: ”میاں۔ اس کے اوپر تشدید بھی تو بناؤ۔“

وہ کوئلہ پھینکتے پھینکتے رک گیا اور مدبر کے اوپر ایک خوش خط تشدید بنا دی۔ پھر شاید خوش ہو کر اُس نے زور سے ہاتھ گھمایا اور جس کوئلے سے اپنا نام لکھا تھا اُسے نہر کے پار پھینکنے کی کوشش کی۔ کوئلہ نہر کے بیچوں بیچ گرا۔ اب اس نے دوسرا کوئلہ اٹھایا، کرکٹ کے بولروں کی طرح کئی قدم دوڑا اور پوری قوّت سے کوئلہ اچھالا۔ وہ بھی پانی کے پار نہ جا سکا۔

اب وہ تیسرا کوئلہ اٹھا رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا: ”کوئلہ ہلکا ہوتا ہے۔ پتھر پھینکو، پتھر۔“

اس نے کوئلوں کی چھوٹی سی ڈھیری وہیں چھوڑی اور ایک ڈھیلا اٹھا کر اسے اچھی طرح ہاتھ میں تولا، بائیں ٹانگ اٹھائی، داہنی ٹانگ پر پیچھے جھکا اور شانے کو جھٹکا دے کر ڈھیلے کو یوں پھینکا کہ اس کا نہر پار جانا یقینی تھا۔

میں جو کراچی کے نسلی فسادات اور ملک کے آئینی بحران کو اب بھول چکا تھا کافی آگے جھکا تاکہ ڈھیلے کو اپنے کنارے پر گرتا ہوا دیکھ سکوں مگر ڈھیلا شاید گول اور وزنی نہیں تھا۔ وہ بھی غڑاپ سے پانی میں گرا اور وہاں تیرنے والی اکیلی بطخ کسمسائی۔ میں نے فوراً ہی لڑکے کی طرف دیکھا۔ اس کے روشن چہرے پر مایوسی کے سائے صاف نظر آئے۔

میں نے دل ہی دل میں کہا "دیکھو میاں، ذرا بڑا سا، گول سا، چکنا سا پتھر اٹھاؤ۔ وہ جائے گا نہر پار" دل میں یہ بات کہہ کر میں نے منہ سے پائپ نکالا، اپنی کشادہ مسکراہٹ کی خاطر۔

لڑکے نے ہر طرف نگاہ دوڑائی۔ پھر وہاں دیوار کے نیچے پڑے ہوئے کچھ پتھروں میں سے ایک پتھر چنا۔ بڑا، گول اور چکنا۔ اس مرتبہ نہ تو وہ بولروں کی طرح دوڑا اور نہ اپنی کہنی اور شانے کو جھٹکا دیا بلکہ کسی پرانے ماہر کی طرح پتھر پھینکا۔ صبح کی دھوپ میں چمکتا ہوا وہ پتھر ہوا میں بلند ہوا اور بڑا سا قوس بناتا ہوا نہر کے دوسرے کنارے پر نہ صرف گرا بلکہ دور تک لڑھکتا چلا گیا۔

میں منہ سے پائپ نکال کر مسکرایا۔ میری یہ مسکراہٹ کشادہ نہیں،

فاتحانہ تھی۔ پھر ایک اور کش لیا۔ تمباکو سارا جل چکا تھا۔ پائپ کو صاف کر کے اور کھرچ کر نیا تمباکو بھرنے کی ضرورت تھی۔ میں نے پائپ سے ساری راکھ جھاڑی اور تمباکو کی ڈبیا کھولنے کی کوشش کر رہا تھا کہ دوبارہ لڑکے پر نظر پڑی۔ وہ کھڑا مجھے تکے جا رہا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ یوں لگا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہو۔

میں نے سوچا "کیا کہہ رہا ہے خدا جانے"

وہ وہیں سے چلایا "نہیں سنا آپ نے؟"

میں نے آہستہ سے کہا "نہیں"

وہ بولا "آپ نے مجھے شاباشی بھی نہیں دی"

یہ کہا اور ٹین کے خالی ڈبے کو ٹھوکریں مارتا ہوا چلا گیا۔

نہر میں تیرنے والی اکیلی بطخ بھی کہیں دور نکل گئی۔

مشکوک سی رغبت

قیوم چاچا اپنے سالانہ پھیرے پر گاؤں آئے تھے۔ وہ اپنے بزرگوں کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے سال کے سال ضرور آتے تھے۔

اس بار بھی گاؤں میں داخل ہوئے تو وہی ہمیشہ جیسی آن بان سے۔ ان کے ساتھ ساتھ کتوں بلیوں کا قافلہ چلا آ رہا تھا۔ ایک بچھڑا بھی تھا اور دھوبی کا وہ گدھا تھا جس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی تھی تو وہ آزاد کر دیا گیا تھا۔ چاچا کے ہاتھ میں مولیاں تھیں جن کے پتے وہ کبھی بچھڑے کو کھلاتے تھے اور کبھی گدھے کو۔ بلیوں کو وہ ساتھ لاتے ہوئے چھیچھڑے پہلے ہی کھلا چکے تھے مگر وہ اور کی توقع میں اب تک ساتھ لگی ہوئی تھیں۔ کتوں کی خبر نہیں کہ ان کے گرد گھیرا کیے ہوئے کیوں آ رہے تھے۔ ایک بار تو ایک جنگلی ہرن بھی ان کے ساتھ ساتھ گاؤں میں آ گیا تھا۔

سلام چاچا، سلام چاچا

ان کا گاؤں میں داخل ہونا تھا کہ ہر طرف سے سلام کے نعرے لگائے جانے لگے۔ عورتوں نے جلدی سے سر ڈھانپ لیے، لڑکیاں لپک کر گھروں میں گھس گئیں اور کواڑوں کی اوٹ سے جھانکنے لگیں۔ چھوٹے بڑے بچے

دوڑ کر قیوم چاچا سے لپٹ گئے اور چھوٹی چھوٹی ہتھیلیاں بالکل یوں پھیلانے لگے جیسے چڑیا شام کو گھونسلے میں آئے تو صبح انڈوں سے نکلے ہوئے بچے چونچیں پھیلاتے ہیں۔

قیوم چاچا بچوں کے لیے اپنے ساتھ کبھی چنے لاتے تھے، کبھی کھیلیں اور کبھی مُرمُرے لیکن اس بار وہ کشمش اور بادام لائے تھے اور شاید کچھ پرانے چلغوزے بھی تھے جن کا رنگ چھوٹنے سے کھدر کی تھیلی بھی بد رنگ ہو گئی تھی۔

بچوں کے بعد اب جوانوں کی باری تھی۔ لڑکوں نے ان کے کندھے پر لٹکا ہوا بڑا سا وزنی تھیلا اتارا اور نئی قلعی والے کٹورے میں کنویں کا ٹھنڈا پانی پیش کیا۔

"چائے پیوگے چاچا، چائے پیوگے؟" اُس شور میں ایک لڑکا مسلسل پوچھے جا رہا تھا۔

"ارے بھائی ذرا دم تو لینے دے۔" یہ کہتے ہوئے قیوم چاچا کھاٹ پر بیٹھ ہی رہے تھے کہ ان کی نگاہ سلیمان پر پڑی۔ جوان ہو کر اُس نے اچھی صورت شکل نکالی تھی۔ چاچا اُسے دیکھ کر نہال ہو گئے۔

"ادھر آ، میرے سامنے آ،" چاچا نے دونوں ہاتھ پھیلا کر سلیمان کے بازو دبائے اور شانے ٹٹولے۔ ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ بولے: "ارے، تُو تو بڑا شاندار جوان نکلا ہے ــــ"

کواڑ کے پیچھے سے جھانکنے والی لڑکیوں کے چہرے سرخ ہو گئے۔

سلیمان نے چاچا کو خوش خبری سنائی "چاچا، چاچا، میں دسویں کے امتحان میں پاس ہوگیا۔"

"اچھا" چاچا کِھل اٹھے۔ فوراً ہی نعیم، سلطان اور راجا بھی خوش ہوکر چلاّئے "چاچا میں بھی — چاچا میں بھی —" چاچا نے ایک ایک کو گلے سے لگایا، ان کے سروں پر ہاتھ پھیرا اور دعائیں دینے لگے۔

اتنے میں سلیمان چائے لے آیا۔ چاچا نے اطمینان سے اپنے سوکھے ہوئے چٹخے ہوئے چمڑے کے جوتے اتارے اور چارپائی پر بیٹھ کر ویسے ہی سوکھے ہوئے چٹخے ہوئے پیر ہوا میں ہلانے لگے۔ بلیاں مایوس ہوکر چلی گئیں، کتے بھی ان کے تعاقب میں نکل گئے، لنگڑے گدھے کو ہنکا دیا گیا اور بچھڑا وہیں قریب آنکھیں موند کر سوگیا۔

گاؤں والے آکر چاچا کی مزاج پُرسی کرنے لگے، اور اپنا اپنا حال سنانے لگے، کسی نے نیا چھپّر ڈالا تھا، کسی کی مرغیاں دو زردیوں والے انڈے دے رہی تھیں، کسی کے بچّے نے جھنجھنا حلق میں پھنسا لیا تھا اور کسی کے ہاں بیٹا ہُوا لیکن وہ شاہ دولہ کے چوہے جیسا۔ ایک ذراسی چارپائی پر اب اتنے بہت سے لوگ سوار تھے کہ وہ پایا جسے لوہے کی پتریوں سے جوڑا گیا تھا، لوگوں کے بوجھ سے ٹوٹ گیا۔ بچھڑا گھبرا کر اٹھ بیٹھا، اور چھوٹے بچّے، جن کے آگے کے دانت ٹوٹے ہوئے تھے، کھلکھلانے لگے۔

لوگ اِدھر اُدھر ہوگئے اور قیوم چاچا سلیمان کا ہاتھ تھامے دوسرے درخت کے سائے میں جا بیٹھے۔ نعیم کی ماں نے تنور میں نان لگانے شروع

کیے، سلطان کی ماں نے مٹکے سے اچار نکالا اور راجا کی ماں دہی کا کونڈا لینے چلی گئی۔

"سُن رے" چاچا سلیمان سے بولے "میں نے شہر میں تیری نوکری کا بندوبست کردیا ہے۔ وہ جو سرکاری لاریوں کا اڈّا ہے نا، اس میں ایک کلرک کی جگہ خالی ہے۔ اڈّے کے مینجر افضال سے میں نے تیری بات کی تھی، اپنا ہی بچّہ ہے، جھٹ تیار ہوگیا۔ کہتا ہے کہ تین سو روپے پکّے ملیں گے اور اڈّے کے پچھواڑے کوارٹر بھی ملے گا۔ اب تو ایسا کر"

یہ کہتے کہتے چاچا اُس کی طرف یوں جھکے جیسے اس کے کان میں کہہ رہے ہوں "کل سویرے ہی چلا جا اور جاکر کام سنبھال، مگر سُن"

اب وہ واقعی سلیمان کے کان میں بولے "گاؤں میں ابھی کسی سے اس کا ذکر مت کیجیو۔"

"اچھا چاچا۔ اچھا" سلیمان نے گردن بالکل یوں ہلائی جیسے کوئی لذیذ شے کھاکر کہہ رہا ہو "بڑے مزے کی ہے، بڑے مزے کی ہے"

اور شام ہونے سے پہلے پہلے اُس نے نعیم کو اپنی نوکری کی خبر سنا دی البتہ خبردار کردیا کہ کسی اَور سے نہ کہے۔ سلطان کو بھی اطلاع کردی لیکن وعدہ لے لیا کہ وہ کسی اَور کو نہیں بتائے گا۔ راجا نے تو خود ہی قسم کھالی کہ وہ سانس تک نہیں نکالے گا۔

اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے نعیم کو کوئی ضروری کام یاد آیا اور وہ شہر چلا گیا۔ سلطان کے پیٹ میں درد ہُوا اور اُسے دوا لینے شہر جانا پڑا۔

راجا کے جوتوں کا چمڑا سوکھ کر چٹخ گیا تھا، وہ نئے جوتے پہنے آخری بس سے شہر کو سدھارا۔

صبح جب سلیمان کنویں سے ٹھنڈا ٹھنڈا پانی کھینچ کر نہا رہا تھا، کواڑوں کی آڑ سے جھانکتی ہوئی گرم گرم نگاہیں اس کے بدن پر صابن کے جھاگ کی طرح بہہ رہی تھیں۔

ماں نے اسے دعائیں دے کر رخصت کیا۔ باپ نے کہا کہ شہر جاتے ہی جوتوں پر پالش کرالیجیو۔ ان کا چمڑا سوکھ رہا ہے۔

بڑی سڑک پر پہنچ کر اُسے کافی انتظار کرنا پڑا مگر خوش قسمتی سے بس کے اندر بیٹھنے کی جگہ بہت تھی۔ وہ ذرا اونچائی پر چڑھی تو بہت دور گاؤں کی چھتیں نظر آئیں اور ان پر آنچل نظر آئے۔

بس کی کھڑکیوں کے زیادہ تر شیشے ٹوٹ چکے تھے۔ تیز ہوا سے جمائے سارے بال بکھر گئے اور وہ ڈرائیور کی نشست کے سامنے لکھا ہُوا کوئی بھونڈا سا شعر پڑھتے پڑھتے اکتا گیا تو اپنی توجہ ہٹانے کے لیے کیلومیٹر کے ہر اگلے پتھر کا انتظار کرنے لگا۔

اتنے میں لاریوں کا اڈا آ گیا۔ سلیمان بس سے اترا ہی تھا کہ سامنے ایک کمرے کے باہر مینیجر کی تختی لگی نظر آئی۔ اُس نے بہت چاہا کہ پہلے جوتے پر پالش کرالے مگر تختی پر مینیجر کا نام محمد افضال اتنا صاف اور خوش خط لکھا دیکھ کر اُس سے رہا نہ گیا۔ کتنے ہی فقیروں کے بچے اس کی ٹانگوں سے لپٹے لیکن وہ سیدھا دروازے پر جا پہنچا۔ دروازہ ذرا سا

کُھلا ہُوا تھا اور وہ آنکھیں پھاڑ کر اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اندر سے کسی کی آواز آئی ــــ "آجاؤ۔"

افضال اپنے ٹیبل لیمپ کی روشنی میں کچھ لکھ رہے تھے۔ انھوں نے قلم آہستہ سے ایک طرف رکھا اور بولے "کیا تم سلیمان ہو، محمد سلیمان؟"

"جی"

"کھڑولی سے آئے ہو؟"

"جی ہاں۔"

"نوکری کے لیے؟"

"جی ہاں، جی ہاں۔"

"قیوم چاچا نے بھیجا ہے؟"

اور اس سے پہلے کہ وہ جی ہاں، جی ہاں کہتا افضال نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "بیٹھ جاؤ۔ اور اپنا تھیلا گود میں نہیں، نیچے فرش پر رکھو۔"

سلیمان آہستہ سے بیٹھ گیا۔ پرانی کرسی کے چرچرانے کی آواز بھی نہیں آئی۔ اب کمرے میں صرف چھت کے پنکھے کی آواز تھی جس نے لاریوں، مسافروں، قلیوں اور سودے والوں کے شور کو بھی دبا دیا تھا، صرف فقیروں کی صدائیں سنائی دے رہی تھیں۔ ایک بار تو سلیمان کو بھی محسوس ہوا کہ وہ دستِ طلب دراز کر رہا ہے۔

افضال دیر تک سلیمان کے چہرے کا جائزہ لیتے رہے یہاں تک کہ

خود سلیمان کے لیے مشکل ہو گیا کہ وہ کدھر دیکھے۔ دو چار بار اُس نے تھوک نگلا، بلا سبب کان کو کھجایا اور انگلیوں میں انگلیاں پرو کر بیٹھ گیا۔

افضال اچانک بولے "کیا یہ صحیح ہے کہ تمہارے باپ فوج میں تھے اور دو سال سے دشمن کی قید میں تھے اور اُس دوران تم ماں کے پیٹ میں آئے تھے؟"

سلیمان کو یوں لگا جیسے سامنے سے آنے والے جھکڑ نے اُسے اُٹھا کر پچھلی دیوار پر دے مارا ہو اور اس کی ریڑھ کی ہڈی کے مہرے بکھر کر فرش پر کھٹ کھٹ گر رہے ہوں۔ اُس نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا اور کم سے کم خود اسے محسوس ہوا کہ وہ جھوٹ چلّا رہا ہے۔

اب افضال نے کہا "تو کیا یہ سچ ہے کہ تم شادی سے پہلے پیٹ میں آ گئے تھے اس لیے تمہارے باپ کو زبردستی شادی کرنا پڑی تھی؟"

سلیمان کو وہ فلم یاد آ گئی جس میں اڑتے ہوئے ہوائی جہاز میں آگ لگ گئی تھی اور ہوا باز نے ایک سُرخ بٹن دبایا تھا۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ کرسی سمیت ہوا میں اچھلا۔ ہوا باز کی تو ہوائی چھتری کھل گئی تھی، سلیمان کی چھتری کی ڈوریاں الجھ گئیں لیکن وہ بچاؤ بچاؤ کی بجائے جھوٹ جھوٹ چلّایا۔

اب افضال نے اپنے ترکش کا تیسرا اور آخری تیر چلایا اور کہا "اس بارے میں کیا کہتے ہو کہ تمہارے باپ غیر مسلم ہیں اور ماں مسلم ہیں لہٰذا ان کا نکاح آج تک نہیں ہُوا ہے؟"

سلیمان کی بھنچی ہوئی مٹھیاں بس اتنی دیر کو کھلیں کہ اس نے فرش پر

پڑے ہوئے اپنے تھیلے کا دستہ پکڑا اور اب کے جو مٹھیاں بھینچیں تو اس بری طرح جیسے ابھی انگلیوں کے درمیان سے خون بہنے لگے گا۔ اُسے اپنے دل کی دھڑکن کانوں میں تو بارہا سنائی دی تھی، اس وقت آنکھوں میں بھی دکھائی دینے لگی۔ اس کی گردن کی رگیں پھڑکنے لگیں اور وہ تن کر کھڑا ہو گیا "کس جھوٹے نے آپ کے کان بھرے ہیں؟"

افضال کا لہجہ اچانک دھیما ہو گیا "نوکری کرنے آئے ہو تو ان باتوں کا عادی بن کر رہنا پڑے گا۔"

"کون سی نوکری؟" سلیمان اپنی بلند آواز خود شُشدر رہ گیا۔

"یہی نوکری جو میں تمھیں دے رہا ہوں۔"

"یعنی آپ مجھے ملازم رکھ رہے ہیں؟"

"ہاں۔"

"میرے بارے میں اتنے قصّے سننے کے بعد بھی؟"

"ہاں ـــ"

"لیکن کیوں؟ ـــ"

"پہلے بیٹھ جاؤ، پھر میں تمہیں بتاؤں گا۔" افضال کے لہجے میں شفقت تھی۔

سلیمان جھکڑ کی طرح اٹھا تھا، ہلکے جھونکے کی طرح بیٹھ گیا اور اس بار اپنا تھیلا خود ہی فرش پر رکھ دیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ گھٹنوں کے بیچ میں دبا لیے کہ کہیں کسی ہاتھ پر دستِ طلب کا گمان نہ ہو اور پنکھے کے

شور اور فقیروں کی صداؤں سے بھی اونچی آواز میں منیجر سے بولا "اب بتایئے کہ آپ مجھے یہ ملازمت کیوں دے رہے ہیں؟"

"سننا چاہتے ہو تو سنو۔" افضال نے بولنا شروع کیا "میری طرف دیکھو۔ دو مرتبہ میری ترقی رکوائی گئی۔ ایک جگہ میری منگنی تڑوائی گئی۔ جہاں کہیں شادی کا پیغام بھیجا گیا وہاں سے پہلے دن لڈو اور تیسرے دن انکار آگیا۔ ایک جگہ بارات گئی تھی مگر لوٹا دی گئی۔ ہماری زندگیوں کی ہر بستی میں قدم قدم پر نعیم، سلطان اور راجا رہتے ہیں۔"

سلیمان آنکھیں پھاڑے ان کی بات سنتا رہا۔ اُسے احساس تک نہ ہوا کہ بات ختم ہو گئی ہے۔ پھر وہ چونکا اور بولا "آپ پر کیا بہتان لگایا گیا تھا؟"

"مجھ پر نہیں۔ میرے والد پر لگایا گیا تھا۔"

"کیا؟"

"یہ کہ جانوروں سے انہیں کچھ زیادہ ہی رغبت ہے ——— مطلب یہ کہ کچھ مشکوک سی رغبت ہے ——— تم جانتے ہو انہیں؟"

"کون ہیں وہ؟" کہتے کہتے سلیمان نے منیجر کی میز کو یوں پکڑ لیا جیسے وہ ڈوب رہا ہو اور بچنے کا واحد سہارا یہ میز ہو۔ "کون ہیں وہ؟"

"تمہارے قیوم بھیا۔ اچھا یہ لو کوارٹر نمبر چھ کی چابی۔ اب جا کے آرام کرو۔ صبح سے کام پر آجانا ——— اور یہ اپنا تھیلا فرش پہ کیوں چھوڑے جا رہے ہو؟ ———"

بہار کا بھید

اُس روز جب درختوں پر نئے پتّے نکلے تو ہوا کی مہک پہلی جیسی نہ تھی۔ فضا میں دھند تھی مگر سوکھی سوکھی سی۔ شاخوں کی رنگت ابھی تک سنولائی ہوئی تھی اور پگڈنڈیوں پر جو نئی گھاس اگی تھی وہ ہری تو تھی مگر اتنی ہری بھی نہ تھی۔ چار دیواریوں کے ساتھ ساتھ اگنے والی جھاڑیاں اس مرتبہ بھی دوسری جھاڑیوں سے اونچی تو تھیں لیکن وہ جو کلیوں کے خوشے پہلے سے نکل آتے تھے وہ کہیں نہ تھے۔

گھاس کے بڑے میدان کی دوسری جانب سیب، ناشپاتی اور آڑو کے درختوں پر پتوں سے پہلے جو پھولوں کی باڑ آتی تھی وہ آئی تو تھی مگر پھول اِس مرتبہ دودھیا اور گلابی نہیں تھے بلکہ ان پر بجھی بجھی سی سرسوں کا گمان ہوتا تھا یا شاید وہ نیلے پڑ گئے تھے۔ ان درختوں کے نیچے چرنے والی بھیڑوں کے پیٹ پہلے سے بھرے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ اُس روز وہ گردنیں اٹھا کر چل رہی تھیں۔ آنکھوں نے یہ منظر پہلے کب دیکھا تھا۔ بھیڑیں تو جب بھی نظر آتی ہیں، گھاس پر جھکی ہوئی ہی نظر آتی ہیں۔

پچھلی خزاں کے گرے ہوئے پتّے پے درپے بارشوں میں بھیگ بھیگ

کر پھول تو گئے تھے مگر گلے نہیں تھے۔ انہیں کترنے والے کیڑے بھی اس سال اُنہیں چھوڑ کر نئی گھاس کی طرف نکل گئے تھے۔ ان پرانے پتوں پہ جہاں پیر پڑتا، نیچے چھپا ہُوا پچھلی بارشوں کا پانی اوپر تک آجاتا اور جوتے بھیگ جاتے مگر یہ پانی اس بار شفاف نہ تھا لیکن گدلا بھی نہیں تھا۔

دھوپ جو نئے پتوں سے چھن کر نیچے آتی تھی اس کی پتلی پتلی لمبی دھاروں میں اُڑنے والے بھنگے آج ماند ماند سے نظر آتے تھے۔ دھوپ جہاں گرتی، پھیل جاتی اور پرانے پتوں کے نیچے چھپے ہوئے پانی میں گھل کر ٹھنڈی ہو جاتی۔ وہ پرانی پرانی سی خوشبو لے کر جو بھاپ اٹھا کرتی تھی، وہ اٹھنے سے پہلے ہی دوبارہ پانی بن جاتی۔

آخر مجھے بیٹھنے کے لیے ایک سوکھی جگہ مل گئی۔ یہ بہت پہلے گرنے والے کسی درخت کا تنا تھا۔ دیکھنے میں کئی سال پرانا تھا مگر مجھے آج پہلی مرتبہ نظر آیا تھا۔ میں بہت سنبھل کر اس پہ آہستہ سے بیٹھا۔ ڈر تھا کہ میرے بوجھ سے یہ کہیں بکھر نہ جائے۔ پرانی لکڑی کی رنگت جیسے کیڑے اِدھر اُدھر دوڑنے لگے۔

میں دیکھ رہا تھا۔ چھوٹی گھاس کے اندر سے اونچی اونچی لکیریں بن کر سیدھی کھڑی ہو جانے والی گھاس کے تنکوں پہ منڈلانے والی جھینگریاں بیٹھے بیٹھے اچانک ارادہ بدل دیتیں اور دوبارہ اُڑ جاتیں۔ شاید مایوس ہو کر وہ گھاس کچھ اور لمبی ہو جاتی جیسے پنجوں پر اونچی ہو گئی ہو مگر اُن پہ بیٹھ کر زور زور سے دیر تک جھولنے والے ٹڈے بھی آج تو اوپر ہی اوپر اڑتے ہوئے

ریلوے لائین کی طرف نکل گئے تھے۔

میں بوجھل آنکھوں سے یہ سارے منظر دیکھتا رہا۔ سر کو خدا جانے کیا ہُوا تھا کہ گردن پہ بوجھ بنا جاتا تھا۔ اپنے پورے وجود کو سہارا دینے کے لیے میں نے دونوں ہتھیلیاں درخت کے تنے پر ٹیک رکھی تھیں۔ تھک کر اپنے دونوں ہاتھ جو اٹھائے اور ہتھیلیوں کو دیکھا تو ان پہ درخت کے پرانے بکل کے نشان بھی نہیں بنے تھے۔ ایسی سپاٹ ہتھیلیاں دیکھ کر میرا سر اور بوجھل ہو گیا اور شانوں پر اُس کا بوجھ اور بڑھنے لگا۔

نئی بہار کی پتیوں پر جو قطرے تھے وہ وہیں جم کر رہ گئے تھے۔ وہ پچھلی بارش کے تھے یا صبح کی شبنم کے، اُن کے رنگ ڈھنگ سے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا۔ مگر وہ نیچے گرنے سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے کہ جیسے کچھ ہو تو گریں۔

پھر مجھے اپنی آنکھ لگ جانے کا علم اس وقت ہوا جب اوپر کہیں سے پچھلی بارش کے پانی یا صبح کی شبنم کا ایک قطرہ میرے ہاتھ کی پشت پر گرا۔ میں نے گھبرا کر ہاتھ اٹھایا تو ہتھیلی پر درخت کے بکل کے گہرے سرخ نشان پڑے ہوئے تھے۔ اپنا سر جو اٹھایا تو وہ اتنا اونچا ہو گیا کہ سبزہ زار کی دوسری طرف ناشپاتی، خوبانی اور آڑو کے پھول صاف نظر آنے لگے۔ ہوا میں اُن کی سفید اور گلابی پنکھڑیاں ہلکورے لے رہی تھیں اور سورج کی سیدھی لکیروں میں اڑنے والے بھنگے اور سوکھے بیج چمک چمک کر لہروں کی طرح اُٹھ رہے تھے۔ سوکھے پتوں کے نیچے چھپے ہوئے پانی سے اٹھنے والی خوشبو صاف کہہ رہی تھی

کہ خود پانی بھی بھاپ بن کر پیچھے پیچھے آنے ہی والا ہے۔

دیکھتے دیکھتے دھوپ ہوا میں گھل گئی اور بہار کی خوشبوؤں کو ہاتھوں پر بلند کیے سبزہ زار میں دوڑنے لگی۔ جی چاہا کہ کسی سے منظر بدل جانے کا سبب پوچھوں۔ کوئی کچھ بتائے اور میری تشفی کر دے۔

اچانک منظر کے اندر نیا منظر کھلا۔ ناشپاتی کے جھنڈ کے پیچھے سے ایک ننھی منی سفید تتلی باہر چمکتی ہوئی دھوپ میں نکلی۔ اس کے پروں پر پڑنے والی دھوپ کے عکس سے ساری فضا چاندی جیسی ہو گئی۔ اب تتلی کے پیچھے دوڑتی ہوئی ایک چھوٹی سی لڑکی نکلی۔ سفید لباس، بالوں میں بندھا ہوا سفید فیتہ اور سفید تسمے والے ویسے ہی چھوٹے چھوٹے جوتے۔۔۔ وہ ماتھے پر گرنے والے بال ہٹاتی جاتی تھی اور دوڑتی جاتی تھی۔

تتلی دھوپ میں آئی تو اونچی اڑنے لگی۔ لڑکی اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر دیر تک اس کے پیچھے سبزہ زار میں چکر کاٹتی رہی اور آخر کار تھک کر خود کو گھاس پر گرا دیا اور آنکھوں میں دھوپ آئی تو انہیں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور ہانپنے لگی۔

مجھے محسوس ہوا کہ ساری بات میری سمجھ میں آ گئی ہے۔ پھولوں کلیوں بھنبھیریوں پرانے پتوں اور پچھلی برسات کی اس بستی میں شاید ایک چھوٹی سی لڑکی کی کمی تھی۔ وہ آ گئی تو منظر مکمل ہو گیا اور زندگی جو چلتے چلتے اچانک ٹھہر گئی تھی، پھر سے رواں ہو گئی۔ اپنے سوال کا جواب پا کر میں بہت مسرور ہوا اور پرانے گرے ہوئے درخت کے اس تنے سے اٹھ کھڑا ہوا جو میں نے وہاں پہلے

کبھی نہیں دیکھا تھا۔

میں اونچا ہوا تو نگاہ نیچی گھاس میں لکیر بن کر کھڑے ہونے والے تنکوں کی طرح پنجوں پر اٹھی اور سبزہ زار کی دوسری جانب خوبانیوں کی پنکھڑیوں میں جا کر کھو گئی جو بہار کی ہوا سے سرشار ہو کر اب فضا میں بکھرنے لگی تھیں۔

اچانک خوبانیوں کے جھنڈ میں کسی کا گلابی لباس نظر آیا۔ کوئی بہت آہستہ آہستہ چلتا ہوا لڑکی کی طرف آ رہا تھا۔ وہی پنکھڑیوں کے رنگ سے ملتے جلتے رنگ کا لباس بتا رہا تھا کہ قدم جس کے بھی ہوں مدھم بہت ہیں۔

اب جو دھوپ چمکی تو درختوں کی آڑ سے ایک عورت نکلی۔ وہ بیساکھیوں کے سہارے چلتی ہوئی باہر دھوپ میں آ رہی تھی۔ پچھلے برس کے گرے ہوئے سوکھے پتے بیساکھیوں کے نیچے آتے تو جل ترنگ جیسی آواز نکلتی مگر بہت دھیمی۔ وہ باہر نکل آئی تو تھکی ہوئی لڑکی اٹھی اور اس کی طرف دوڑی لیکن جل ترنگ کے سروں میں اس کی آواز نہیں ڈوبی کیونکہ اس نے امی کہہ کر پکارا تو مجھے صاف سنائی دیا۔ لڑکی نے ماں سے بیساکھیاں لے کر گھاس پر لٹا دیں اور اسے سہارا دے کر چلانے لگی۔ دونوں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی نشیب سے اوپر آ گئیں۔ لڑکی نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر اجلی دھوپ میں بٹھا دیا اور اس کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔ ماں جھکی۔ بچی کی پیشانی پر بار بار آ جانے والی لٹیں ہٹائیں اور اسے چوم لیا۔ یہ سارا منظر پلکوں میں الجھے بغیر میری آنکھوں کے راستے کہیں گہرائیوں میں اتر گیا۔

یُوں اُس روز مجھ پر یہ بھید کھلا کہ ہوائیں بھی اُس وقت تک نہیں چلتیں جب تک کوئی ہاتھ تھام کر انہیں سہارا نہ دے اور بہار کی پیشانی سے بال ہٹا کر اُسے چوما نہ جائے تو وہ نہیں آتی۔

یوں اُس روز مجھ پر یہ بھید کھلا۔

شاہ صاحب کا کمال

اکرم اور رانی کی شادی کو اب اٹھارہ سال ہو گئے تھے اور رانی کی ساس اُسے طعنے دیا کرتی تھی کہ اتنے عرصے میں اُس کے ہاں ایک چوہیا کا بچہ تک نہیں ہوا۔ یہ بات سن کر رانی کی آنکھوں میں اس ڈاکٹرنی کا چہرہ گھوم جاتا جس نے بڑی دیر معائنہ کرنے کے بعد کہا تھا کہ بی بی، تم بالکل ٹھیک ہو۔

اب یوں بھی نہیں تھا کہ اکرم چین سے بیٹھ گیا ہو۔ اُسے بھی اولاد کا ارمان تھا اور اکثر کہا کرتا تھا کہ ماں اپنے دو چار پوتے پوتیاں دیکھ لے تو اُسے بھی سُکھ ملے۔ اکرم کے دوست اُسے طرح طرح کے مشورے دیا کرتے۔ کسی نے کہا کہ شُبھ گھڑی دن میں بھی آ سکتی ہے۔ کسی نے کہا کہ بھابی سے کہو کہ غسل میں تاخیر کیا کرے۔ انیس اسے کسی وید کے پاس لے گیا۔ اکبر کسی سنیاسی کے پاس لے گیا۔ فضل نے عیسائیوں کے اسپتال کے کئی پھیرے لگوائے۔ کوئی کہیں سے تعویذ لکھوا کر لے آیا اور ہومیوپیتھی کی میٹھی گولیاں تو بہت سے دوست لائے۔

اُن ہی دنوں دہرہ دون سے اعجاز آ پہنچا۔ اٹھارہ سال پہلے اکرم

اور رانی کی شادی میں وہ دیوانوں کی طرح ناچا تھا اور چند روز بعد ہی مروے کی ملازمت کرنے دہرہ دون چلا گیا تھا۔ وہ جو آیا تو دوستوں نے بڑا جشن منایا۔ راتوں کو دیر تک باتیں ہوئیں۔ قہقہے لگے اور نوجوانی کے سارے پرانے لطیفے دوبارہ سنائے گئے اور اب اُن لطیفوں میں اور زیادہ بے تکلفی آگئی تھی۔

پھر ایک روز اعجاز نے حضرت گودھڑے شاہ کا قصہ سنایا۔ ان کا مزار ہماچل کی کسی پہاڑی کی چوٹی پر ہے۔ لوگ بڑے کشٹ اٹھا کر وہاں جاتے ہیں، بیویوں کو لے جاتے ہیں، تین راتیں وہیں گزارتے ہیں۔ بیویاں ایک رات حضرت کا دایاں شانہ چومتی ہیں، دوسری رات بایاں شانہ اور تیسری رات قبر کی پائنتی کو بوسہ دیتی ہیں اور شاہ صاحب کی عنایات اور کرامات سے مرادوں کی جھولیاں بھر بھر کر لوٹتی ہیں۔

اعجاز نے ذرا ذرا سی تفصیل سنائی کیونکہ وہ کتنے ہی رشتے داروں اور واقف کاروں کو حضرت گودھڑے شاہ کی زیارت کرا کے لایا تھا اور خیر سے سب کے گھر آباد تھے۔

"پہاڑ کی چوٹی پر رہیں گے کہاں ؟" اکرم نے پوچھا۔

"وہاں بیسیوں چھپّر پڑے ہیں۔ لوگ ان میں رہتے ہیں، وہیں کھاتے پکاتے ہیں اور بڑے چین سے بسر ہوتی ہے۔"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ رانی بھی آ گئی۔ اعجاز نے شاہ صاحب کی کرامات کے وہ سارے قصے سنا دیے جو مزار پر دودو آنے میں بکنے

والی کتابوں میں لکھے تھے۔

رانی نے اکرم کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ اُس کی ماں نے چولہے کی آنچ کم کرتے ہوئے ڈوئی کو آہستہ سے ہنڈیا کے اُوپر ٹکایا اور ساری کے پلّو سے ہاتھ پونچھتے ہوئے بولی "بس اب خدا کا نام لے کر چل پڑو۔ پروردگار چاہے گا تو میرے آنگن میں میرے پوتے پوتیاں گھٹنیوں گھٹنیوں چلیں گے۔ میری آنکھوں میں بھی ٹھنڈک پڑے گی۔"

رانی اُٹھ کر جانے لگی تو اکرم نے کہا "فوراً ہی بستر بند باندھنے چل پڑی ہے کیا؟"

سب دیر تک ہنستے رہے۔

پہاڑی راستہ بہت دشوار تھا۔ بستر اور ٹرنک تو رہے ایک طرف، لوگ کھانے پینے کا سامان بھی کم ہی لے جاتے تھے۔ مال اسباب لے کر چڑھنے والے ہانپ جاتے تھے اور کتنوں نے تو راستے میں اپنا سامان خرد برد کر دے دیا۔

چند برس پہلے مقامی لوگ اپنے خچر لے آئے تھے اور ایک روپیہ سواری کے حساب سے لوگوں کو مزار تک پہنچاتے تھے۔ کاغذ کے نوٹ لینے سے وہ انکار کرتے تھے اس لیے لوگ اپنے ساتھ چاندی کے روپے لایا کرتے تھے جو ہاتھ کے انگوٹھے پر ٹھن سے بولتے تھے۔ مگر پھر یہ ہُوا کہ مرادیں پوری ہونے کا سلسلہ رک گیا اور حضرت نے اپنا جلال یوں دکھایا کہ اچھے بھلے خچر پہاڑی راستوں سے چکرا کر نیچے گرنے لگے۔ حاجت مندوں نے خچروں پر

بیٹھنے سے انکار کردیا اور پھر وہی سلسلہ چل نکلا۔ میاں بیوی اور عموماً ایک مدد گار ان پگڈنڈیوں پر چڑھتے تھے تو دور سے یوں لگتا تھا جیسے مٹھائی کے انبار پر چیونٹیوں کی قطاریں چلی جارہی ہوں۔

رانی، اکرم اور اعجاز ترلوک پور کے چھوٹے سے اسٹیشن پر اترے اور بیل گاڑی میں بیٹھ کر پہاڑ کے دامن کی طرف چلے۔ ببول کے جنگل کی ٹھنڈی ہوا لگی تو اعجاز گانے لگا۔ اکرم نے اس کی لے میں لے ملائی تو رانی کے چہرے پر ڈھلتے سورج کی پیلی دھوپ نے وہ دن یاد دلا دیئے جب وہ مانجھے بیٹھی تھی پیشانی پر پسینے کے قطرے افشاں بن گئے۔ اکرم کو وہ خوشبو یاد آگئی جو سہاگ جوڑے میں بند ھ کر آئی تھی اور اعجاز کو شادی والے روز اپنا ناچنا یاد آنے لگا۔

رات تک پہاڑی کے دامن میں بے شمار زائرین جمع ہو چکے تھے اور ہر طرف الاؤ جلا کر دیہاتی مرغیاں بھونی جارہی تھیں اور انڈے تلے جارہے تھے۔ اگلی صبح جوں ہی سورج نکلنے کے آثار نمودار ہوئے، حاجت مندوں کے قافلے پہاڑی پر چڑھنے لگے۔ رانی نے پہلے تو اکرم کا بازو تھاما لیکن جب راستہ دشوار ہونے لگا تو اسے اعجاز کا سہارا بھی لینا پڑا۔ اب اس کے دو ہاتھوں میں دو بازو تھے اور دونوں کتنے مختلف۔

دور سے تو پہاڑی کی چوٹی قریب نظر آئی تھی لیکن جوں ہی چڑھائی شروع ہوئی چوٹی نے پرے سرکنا شروع کردیا۔ دوپہر تک اکرم ہانپ گیا اور رانی کی ٹانگیں شل ہوگئیں۔

آگے پگڈنڈی بہت تنگ تھی۔ اب یہ تینوں پہلو بہ پہلو نہیں چل سکتے تھے۔ اکرم کو آگے رکھا گیا۔ رانی نے اس کا کرتا مضبوطی سے تھام لیا۔ اعجاز پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ جب تک وہ رانی کو نیچے گہرائی میں نہ دیکھنے کا مشورہ دیتا رہا سب ٹھیک رہا مگر جب اس نے رانی سے کہا کہ تیری ایڑیاں سوکھ کر پھٹ گئی ہیں۔ ان پر صبح شام گلاب کی خوشبو والی ویسلین لگایا کر تو رانی کے ٹھنڈے پسینے پر لگنے والی ہوا گرم ہوگئی۔

شام ہونے سے پہلے زیادہ تر قافلے چوٹی پر پہنچ گئے۔ حضرت گود بھرے شاہ کی قبر پر کئی کے جھنڈے جل چکے تھے اور ہری چادروں کا گوٹہ چمکنے لگا تھا اور اگربتیوں کا دھواں گلاب کی پنکھڑیوں میں الجھنے لگا تھا اور مجاوروں نے اپنی آنکھوں میں ہر روز سے زیادہ ہی سُرمہ کھیپ رکھا تھا اور ان کے سروں کا سارا تیل ماتھے پر بہہ کر ان کی ٹوپیوں کے کناروں میں جذب ہو چکا تھا۔

سارے ہی زائرین کو ایک ایک خالی چھپر مل گیا۔ پردے ڈال دیئے گئے، چادریں تان دی گئیں اور تھکی ہاری عورتیں حضرت کا دایاں شانہ چومنے چلی گئیں۔ وہ جو ایک روز پہلے آئی تھیں وہ تازہ دم ہو کر حضرت کے بائیں شانے پر جھکی جارہی تھیں اور دو روز پہلے آنے والی عورتوں میں اتنی توانائی آگئی تھی اور مراد پوری ہونے کے یقین نے ان میں اتنی سرشاری بھر دی تھی کہ جب وہ چادر اٹھا کر حضرت کی قبر چومتیں تو چومنے کی آوازیں دور والے اُس چھپر تک پہنچتیں جہاں اعجاز اکیلا بیٹھا تھا۔

تین روز بعد یہ لوگ پہاڑی سے اترے تو بڑے بڑے ڈگ بھرتے اُترے۔ وقت نے بھی ان سے ڈگ بھرنا سیکھ لیا اور وہ شام آگئی جب اکرم کی ماں اچھوانی پکانے کھڑی ہوئی تو اسے زچہ خانے کے ان سارے گانوں کے بول یاد آگئے جو گھر کے پچھواڑے دھوبنیں گایا کرتی تھیں۔

ماں کی خوشی دیکھ کر اکرم یوں ناچا جیسے اٹھارہ سال تو میرے پہلے اعجاز ناچا تھا۔ وہ رانی کے قریب پہنچا تو وہ پسینے میں تر ابور نظر آئی اور اس کی رنگت کچھ ایسی لگی جیسے ڈھلتی شام کے سورج کی پیلی دھوپ۔

اتنی دیر میں مبارک باد دینے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ انیس بھی آیا، اکبر اور فضل بھی۔ اڑوس پڑوس کی عورتوں نے اکرم کی ماں کو گھیر لیا اور گود میں لیٹے ہوئے اس کے پوتے کو جھک جھک کر قریب سے دیکھنے لگیں۔ ہر ایک کو اُس میں رانی کی جھلک نظر آرہی تھی۔ اس سارے مجمع کے درمیان کھلے گلاب کی مانند بیٹھی اکرم کی ماں خوشی کے مارے مسلسل بولے چلی جارہی تھی۔ کسی نے کچھ کہا تو بولی "اے بہن یہ تو پہاڑی والے شاہ صاحب کا کمال ہے۔"

رانی اور اکرم دونوں ہی نے یہ بات سنی۔
رانی مسکرائی اور چپ ہو گئی۔
اکرم چُپ ہُوا اور مسکرا دیا۔

واردات کا آدمی

میں سارے مکالمے دل ہی دل میں تیار کر رہا تھا۔
جاتے ہی کہوں گا — "بڑے نالائق ہو۔ تم نے لکھنا کیوں بند کر دیا؟"۔
وہ کہے گا — "زمانے کے جھنجھٹ مارے ڈالتے ہیں۔ ان سے ذرا فرصت ملے تو لکھوں"۔

میں کہوں گا — "خاک ڈالو ان جھنجھٹوں پر۔ یہ تو سب کی جان کو روگ بن کر لگے ہوئے ہیں مگر ان سے کام تو بند نہیں ہُوا کرتے۔ اتنا اچھا لکھتے ہو۔ خدا نے ایسی عمدہ صلاحیت دی ہے۔ رشید احمد صدیقی کہتے ہیں کہ خدا جو صلاحیت دے اُسے بروئے کار لانا بھی عبادت ہے"۔

وہ مسکرا کر کہے گا "کیا رشید احمد صدیقی کو پڑھ رہے ہو ان دنوں؟"
میں کہوں گا "پھر کیا کروں؟ تم نے لکھنا بند کر دیا تو مجھے ان کی طرف لوٹنا پڑا —"

ذہن میں کچھ ایسی گفتگو اپنے آپ کو ترتیب دے رہی تھی۔ مجھے اسکول کے وہ دن یاد آرہے تھے جب ہم نے میگزین نکالا تھا اور اُس نے اتنا اچھا مضمون لکھا تھا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب نے کلاس روم میں سب کو پڑھ کر

سنایا تھا۔

اسکول سے نکل کر ہم مختلف کالجوں میں چلے گئے۔ اس کی کہانیاں ادبی رسالوں میں نظر آنے لگیں۔ دیکھتے دیکھتے اس کی تحریر پر نکھار آیا اور ساتھ ہی شگفتگی آتی گئی۔ کبھی کبھی تو جملوں میں رس بھرا ہوتا تھا عبارت کو اس طرح آگے بڑھاتا تھا کہ ایک جملہ اپنے خاتمے تک پہنچتے پہنچتے شاخ بنتا تھا اور اگلا جملہ اُس سے شگوفے بن کے پھوٹتا تھا۔

ایک بار کسی نے کہا کہ وہ پاکیزہ نثر لکھتا ہے۔ یہ سن کر مجھے ایسی خوشی ہوئی جیسے وہ نہیں لکھتا۔ میں لکھواتا ہوں۔

اس کے کالج کے بزرگ پرنسپل پرانی وضع کے آدمی تھے۔ ہمیشہ بائیسکل پر بیٹھ کر کالج آیا کرتے تھے۔ ایک روز اُن کی بائیسکل کا پینڈل ٹرام کی پٹڑی میں پھنسا۔ وہ کچھ اس طرح گرے کہ سر پھٹا اور شام ہونے سے پہلے پہلے مر گئے۔

اس نے ان کی موت پر مضمون لکھا جس کی دھوم مچ گئی۔ دل پر ایسا اثر کرتا تھا کہ پسماندگان بھی ایک ایک کو دکھاتے پھرے۔

میں نے کہا: "خوب لکھتے ہو۔"

کہنے لگا: "واردات کا آدمی ہوں۔ میں نہیں لکھتا۔ مجھ سے واردات لکھواتی ہے ___"

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک برس غضب کی سرسوں پھولی۔ یہ حال ہوا کہ کھیتوں سے پھیلتے پھیلتے پھول کچی سڑکوں تک آ گئے اور بیل گاڑیاں

انہیں روندنے لگیں۔ اُس نے بے حد حسین عبارت لکھی۔

ایک سال دریا میں طغیانی آئی اور شہر کے لوگ حسبِ معمول غریب دیہاتیوں کی بستی بہتی ہوئی لاشیں دیکھنے کے لیے پل پر چڑھ گئے۔ بڑے انتظار کے بعد انہوں نے دیکھا کہ پھونس کا چھپّر بہا چلا جا رہا ہے اور اس پر لیٹا ہوا ایک دودھ پیتا بچہ اپنے پیر کا انگوٹھا چوس رہا ہے اور پیر میں کالا ڈورا بندھا ہوا ہے۔

اب جو اُس نے کہانی لکھی تو میں نے بے ساختہ پوچھا کہ اتنے اچھوتے خیال کہاں سے لاتے ہو؟

پھر اُسی طرح مسکرایا اور پھر وہی جواب دیا: "واردات کا آدمی ہوں۔"

ایک بار دھوم مچی کہ اُس نے چھوٹا سا ناول لکھا ہے۔ میں کسی پرائے شہر میں تھا۔ بڑی دوڑ دھوپ کے بعد اس کا ناول ملا اور میں نے اگلی صبح نمودار ہونے تک پڑھ ڈالا اور خط لکھ کر شکایت کی کہ تم نے عشق کیا اور ہمیں بتایا بھی نہیں۔ خیر۔ اگرچہ تم عشق میں نامراد رہے ہو مگر ادب کا دامن مراد تم نے خوب بھرا ہے۔

کسی رسالے میں اس کے ناول پر تبصرہ چھپا اور تبصرہ نگار نے لکھا کہ اگر عشق کی ناکامی ایسے اعلیٰ ادب کی تخلیق کرتی ہے تو یہ دعا مانگی جا سکتی ہے کہ خدا کرے اس کے اور بھی کئی عشق ناکام ہوں۔

مجھے وہ منظر یاد رہے گا جب ایک نشست میں اس نے اپنی چھوٹی سی

کہانی پڑھ کر سنائی۔ بڑی داد ملی اور ایک صاحب اُٹھ کر اُس سے لپٹ
گئے اور مچل گئے کہ یہ کہانی مجھے عطا کر دیجئے، تمام عمر سینے سے لگا کے
رکھوں گا۔۔۔۔

مجھے یاد تھا کہ لڑکیاں اُسے بہت عاجز کیا کرتی تھیں۔ آٹو گراف
لینے والیوں کو تو خیر جانے دیجئے' مجھے ان لڑکیوں پر حیرت ہُوا کرتی تھی جو
اس سے پوچھا کرتی تھیں کہ فلاں افسانے والی فرزانہ کیا اصلی تھی اور فلاں
کہانی والی رخسانہ کیا کالج آف ہوم اکنامکس والی مِس شہناز تھیں؟

وہ شرما کے رہ جاتا تھا۔

عجیب تحریر تھی اس کی۔ تمام پرانی باتیں بالکل نئے انداز سے کہتا
تھا، ایسا انداز جو اُس سے پہلے کبھی کسی نے اختیار نہیں کیا۔ ایک بار ایک
ادبی نشست میں کسی نے اُس سے پوچھا تھا کہ آپ دنیا کے کس ادیب
سے متاثر ہیں تو اس نے مسکرا کر جواب دیا تھا: "ٹمبکٹو کے مسٹر ادمبا لومبا
سے۔"

اب ادھر ایک عرصہ ہو گیا تھا اور کہیں کسی کتاب کسی رسالے میں
اس کی کوئی تحریر نہیں چھپی تھی۔ ادب کے سالانہ جائزوں میں اس کا ذکر
تک نہ تھا۔

ایک سال موسم بہار میں گلاب اس شدت سے کھلا کہ رنگوں کا سیلاب
آگیا۔ پہاڑی راستوں پر گلاب کی بیلیں ایسی پھیلیں کہ سر پر پانی کے گھڑے
اٹھا کر چلنے والی عورتوں کا چلنا دو بھر ہو گیا۔ اُور تو اُور گائے بھینسوں کے

دودھ کا ذائقہ بدل گیا۔ مگر کہیں اس کی کوئی تحریر نہیں چھپی۔

میں سوچ رہا تھا کہ جاتے ہی اُس سے پوچھوں گا کہ تمہیں کیا ہو گیا۔
وہ زمانے کی الجھنوں کا رونا روئے گا اور میں الجھنوں کے فلسفے پر ایسی تقریر
کروں گا کہ اسے کہنا پڑے گا: "اچھا بابا، کوئی واردات ہو جانے دو۔"

مجھے پتہ تھا کہ وہ کہے گا کہ اب وہ فرصت کے دن نہیں رہے۔
بچے بڑے ہو گئے ہیں۔ ان کی فکر ختم ہو تو افسانے کی فکر کروں۔۔۔ اور میں
تمام معتبر ادیبوں شاعروں کا حوالہ دے کر ثابت کروں گا کہ انھوں نے اپنا
بہترین ادب شادیوں اور اولادوں کے بعد تخلیق کیا تھا۔

جوں ہی میری سائیکل اس کی گلی میں مڑی' اس کے گھر کے سامنے
اس کا چھوٹا بیٹا بیٹھا نظر آیا۔ اس کے جوتے میں شاید چھوٹا سا کنکر چلا گیا
تھا۔ وہ فرش پر بیٹھا، جوتا اتار کر اُسے زور زور سے جھٹک رہا تھا۔

میں نے قریب پہنچ کر سائیکل منڈیر سے لگاتے ہوئے اُس سے
پوچھا: "ابا ہیں گھر میں؟۔۔۔"

یوں لگا کہ جوتے کا کنکر اس کے اعصاب کی کگر پر بڑی سی چٹان
کی طرح ٹکا ہُوا تھا جو میرا سوال سن کر بری طرح لڑھکا اور اس کے وجود
پر گرا اور جب اُس سے اُٹھنے والا گرد کا بادل چھٹا تو لڑکا بولا: "ہاں۔"

میں نے پوچھا: "کیا کر رہے ہیں؟۔۔۔"

وہ بولا۔۔۔ "لکھ رہے ہیں۔"

مجھے اپنی آنکھوں میں اپنی ہی آنکھوں کی چمک نظر آنے لگی۔ میں نے

پوچھا ــــ "لکھ رہے ہیں؟ ــــ"

وہ بولا ــــ "ہاں ــ بس لکھے جا رہے ہیں ــــ"

میں نے پوچھا ــــ "کب سے؟ ــــ"

وہ بولا ــــ "جب سے باجی ہندو لڑکے کے ساتھ بھاگی ہیں وہ بیٹھے لکھے جا رہے ہیں لکھے جا رہے ہیں"

اس کا یہ کہنا تھا کہ کوئی چیز رک گئی۔ شاید میرا دل۔ یا شاید میرے قدم۔ میرے جوتے کے اندر بہت سے کنکر بھر گئے اور میرے وجود کے اندر یوں بجنے لگے جیسے میں ٹین کا خالی ڈبا ہوں۔

گھر کا دروازہ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ میں اُسے اور کھولنے کی بجائے خود آڑا ترچھا ہو کر اندر داخل ہوا۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اور تمام کمروں میں جھانکتا ہوا آخری کمرے میں پہنچا۔

وہ باغ میں کھلنے والی کھڑکی کی طرف رخ کیے بیٹھا تھا۔ تازہ گھاس کو چھو کر آنے والی ہری ہری دھوپ اُس کے الجھے ہوئے بالوں میں اور الجھ رہی تھی۔ کرسی پر وہ نیم جان ہوا بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھ کی کہنی کرسی کے ہتھے پر ٹکی ہوئی تھی اور وہ انگلی سے ہوا میں لکھے جا رہا تھا ــــ لکھے جا رہا تھا......

رئوف اور کُتیا کا پلّا

بستی والوں کو یہ تو یاد تھا کہ پہلے پہاڑوں کی رنگت نیلے تھوتھے جیسی ہوگی، لیکن یہ یاد نہیں تھا کہ پہاڑ اس کے کتنے عرصے بعد دھنسیں گے۔ بزرگ سمجھا گئے تھے کہ ایک روز یہ سامنے والے پہاڑ خود اپنے ہی بوجھ سے دھنسنے لگیں گے، اور بتا گئے تھے کہ جوں ہی پہاڑ دھنسیں، تم لوگ سارا مال اسباب سمیٹنا، مال مویشی جمع کرنا، عورتوں اور بچوں کو گاڑیوں پر لادنا اور سوکھے دریا کے راستے لپکنا اور اُس وقت تک نہ ٹھہرنا جب تک ہوا کی بو بدل نہ جائے۔

بستی والے دھیان سے دیکھ رہے تھے اور ڈھلتی دھوپ میں صاف دکھائی دے رہا تھا کہ پہاڑوں کی رنگت بجھتی جا رہی ہے۔ اس پر ایک روپ سا ہوا کرتا تھا، وہ جاتا رہا ہے اور کہیں کہیں چٹانیں نیلے تھوتھے جیسی نظر آنے لگی ہیں۔

فضل نے کہا: "بس اب زمین اس کا بوجھ نہیں اٹھا پا رہی ہے پہاڑ اب دھنس جائے گا۔"

مولا داد نے پوچھا "دھنس کر کہاں جائے گا؟"

رحمت نے جواب دیا "یہاں دھنسے گا تو کہیں اور اُبھرے گا۔ کون جانے کہاں ابھرے۔"

رؤف زور زور سے رونے لگا۔ اس کا بسکٹ بھائی کے فوجی بوٹ تلے کچل کر چورا چورا ہو گیا تھا۔ چودھری شہر سے آئے تھے تو ہر بچے کو ایک ایک بسکٹ دیا تھا۔ سارے کے سارے اسی وقت کھا گئے۔ رؤف نے اپنے حصے کا بسکٹ قمیص کی جیب میں ٹھونس لیا کہ وہ بعد میں تازہ دودھ کے ساتھ کھائے گا۔ دودھ دوہنے کا وقت آ پہنچا۔ وہ گائے کے تھن دھونے کے لیے جھکا تو بسکٹ جیب سے نکلا، دور تک لڑھکا اور اگلے ہی لمحے بھائی اُس پر اپنا بھاری بھرکم بوٹ رکھتے ہوئے گزر گیا۔

بسکٹ کچلنے اور رؤف کے رونے کی آوازیں آپس میں مل گئیں۔ وہ بھائی کو مارنے دوڑا، بھائی لپک کر دیوار پر چڑھ گیا۔ رؤف کہے جا رہا تھا کہ تم نے جان کر کچلا ہے۔ بھائی انکار تو کر رہا تھا مگر ساتھ ساتھ ہنستا بھی جا رہا تھا۔

اس ہنسی نے اس کے انکار میں سے اعتبار نکال دیا تھا۔

رؤف روئے جا رہا تھا اور کچلے ہوئے بسکٹ کے چورے پر انگلیاں پھیر پھیر کر اسے مٹی میں ملائے جا رہا تھا۔

بھائی بولا — "مٹی میں کیوں ملا رہا ہے۔ کیا میں کھا جاؤں گا؟"

"ہاں" — روتے روتے رؤف کے منہ سے رال ٹپکنے لگی۔

کہیں سے بہن نکل آئی اور اُسے بہلاتی پھسلاتی اپنے ساتھ لے گئی ادھر کتیا کا پلا دوڑا دوڑا آیا اور زمین کو سونگھنے لگا اور پھنکاریں مارنے لگا۔ اب صرف وہی جانتا تھا کہ مٹی کا ذرہ کون سا ہے اور بسکٹ کا ریزہ کون سا۔

شام ڈھل رہی تھی اور گاؤں کے لڑکے بحث کر رہے تھے کہ پہاڑ کے ایک سپاٹ حصے میں جو شگاف سا نظر آ رہا ہے وہ ابھی پڑا ہے یا پرانا ہے۔

بہن نے اپنے دوپٹے سے رؤف کے آنسو تو خشک کر دیئے تھے مگر اس کی ہچکیاں پانی پلانے سے بھی نہیں رکیں۔

چودھری حیران تھے کہ گاؤں کے لڑکوں نے کبھی نیلا تھوتھا نہیں دیکھا صرف نام سنا تھا کیونکہ نسیم کی شادی اس کی مرضی کے خلاف ہونے لگی تھی تو اُس نے مٹھی بھر کر نیلا تھوتھا ہی پھانکا تھا۔

کتیا کا پلا تھک ہار کر سو گیا تھا۔

اگلی شام چودھری نے رؤف کو مٹھی بھر کر ستو دیا "لے کھا لے اور بھائی کا پیچھا چھوڑ دے۔ اب کے جاؤں گا تو تیرے لیے بارہ بسکٹ لاؤں گا، نہیں بارہ نہیں۔ دس۔"

چودھری نے تعداد گھٹا دی تاکہ انگلیوں سے دکھا سکے کہ دس کتنے ہوتے ہیں۔ رؤف ابھی بہت چھوٹا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ نسیم کو نماز جنازہ پڑھے بغیر کیوں دفن کیا گیا۔ اُسے پہاڑ میں بھی کوئی عجیب بات نظر نہیں آتی تھی۔ وہ اور کتیا کا پلا، دونوں مل کر شام تک گلہریوں کے پیچھے دوڑتے رہے۔ پلے نے چڑیوں پر منہ مارنے کی کوشش کی تو رؤف ہنستے ہنستے زمین پر لوٹنے لگا اور پلا قریب آ کر اس کی خالی جیب سونگھنے لگا۔

عورتیں اندھیرا ہونے سے پہلے پانی بھرنے جوہڑ پر گئیں تو وہ بھی پہاڑ

کو غور سے دیکھتی گئیں۔ ان میں جتنی کم عمر تھیں انھیں پہاڑ میں کچھ بھی نظر نہ آیا۔

گاؤں کے بوڑھے رات کا کھانا کھا کر حقہ پینے بیٹھے تو پھر پہاڑ کا ذکر نکل آیا اور یہ بحث چھڑ گئی کہ سوکھا دریا کہاں تک جاتا ہے۔ ہوا کی بو بدلتے کسی نے آج تک نہیں دیکھی۔ پھر کیسے پتہ چلے گا کہ ہوا کی بو کب اور کہاں بدلی۔ ایک بوڑھا بضد تھا کہ پہاڑ دس سال سے پہلے نہیں دھنسے گا۔ دوسرا فساد پر آمادہ تھا۔ وہ چار جماعتیں پڑھا ہوا تھا اور اس نے کبھی نہیں سنا تھا کہ پہاڑ اپنے بوجھ سے بھی دھنسا کرتے ہیں۔ اس کی تعلیم کا رعب تھا یا شاید کچھ اور کہ اس کے جواب میں پہلے حقے کی گڑگڑاہٹ سنائی دی اور پھر بہن کی آواز جو رؤف کو ڈانٹ ڈپٹ کر سلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

وہ بڑی مشکل سے سویا۔ اتنے چھوٹے سے لڑکے کو چھوٹے چھوٹے خراٹے لیتے سنا تو بہن مسکرا دی اور فرش پر اپنے سونے کے لیے جگہ بنانے لگی۔ بھائی اپنے فوجی بوٹ وہاں اتار گیا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اٹھ کر ہٹاؤں یا لات مار کر۔ آخر اُس نے لات ماری اور پھر ایسی سوئی کہ اپنے چھوٹے چھوٹے خراٹے بھی نہ سُن سکی۔

یہ تو پتہ نہیں کہ رات کا کون سا پہر تھا۔ رؤف تڑپ کر اٹھا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ایسا تو وہ کبھی نہیں رویا تھا۔ اس کے یوں اٹھنے سے گھر بھر اٹھ بیٹھا۔

"کیا ہو گیا رے۔ کیوں روتا ہے رے"

اس کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ بہن پانی کا کٹورا لیے کھڑی تھی مگر اس نے ہاتھ مار کر کٹورا گرا دیا۔ آخر باپ نے قریب آ کر پوچھا۔ "کیا بات ہے رؤف؟"

وہ روتے روتے بولا — "بھائی۔ اُدھر —"

ماں نے پوچھا — "کدھر؟"

اس نے پہاڑ کی طرف اشارہ کیا۔ "اُدھر — بھائی — میرا بسکٹ کچل رہا ہے"

سب چپ ہو گئے۔ ایسا سناٹا چھایا کہ خود رؤف سہم گیا اور ماں سے لپٹ گیا۔ بہن نے اپنی کھانسی پر اور بھائی نے ہنسی پر قابو پایا۔ باپ نے سانس روکی۔ پہاڑ کی طرف سے آواز آ رہی تھی۔ وہ چودھری کے گھر کی طرف لپکا۔ رؤف کا رونا سن کر فضل بھی اپنے گھر سے نکل آیا تھا — مولا داد بھی دروازے میں آ گیا۔ رحمت کو اس کی بیوی جگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کتیا کے پلّے نے بھی ہر گری پڑی چیز کو سونگھنا موقوف کر دیا۔ پہاڑ کی طرف سے آوازیں آ رہی تھیں۔ بھاری بھرکم بوٹ تلے بسکٹ روندے جانے کی آوازیں۔

لوگوں نے چودھری کے فیصلے کا انتظار کیے بغیر مال اسباب سمیٹنا شروع کر دیا۔ بیل کم تھے اور گاڑیاں زیادہ مگر جتنے بھی تھے وہ جوت دیے گئے۔ وہ سنسان اندھیرے جتنے کے عادی تھے، سر جھکا کر جت گئے۔

ہر ایک سراسیمہ تھا۔ صرف رؤف سوکھے دریا میں چلتی بیل گاڑی کے ہچکولوں کے باوجود آنکھیں موندے سو رہا تھا۔ میں نے جھک کر غور سے سنا۔ وہ چھوٹے چھوٹے خرّاٹے لے رہا تھا۔

سفر بہت کڑا تھا۔ صبح نے ہونے میں دیر لگائی۔ بڑی مشکل سے ہوئی تو سب گھبرا گھبرا کر پہاڑ کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ دور نکل آئے ہیں، پہاڑ نظر نہیں آئے گا۔ مگر وہ تو پہلے سے بھی بڑا اور قریب نظر آ رہا تھا اور اُس پر روپ بھی آ گیا تھا۔ نیلے تھوتھے جیسی رنگت بھی جا رہی تھی۔

کسی نے رؤف سے پوچھا "اب بھی آواز آ رہی ہے یا نہیں ہے؟"

وہ بڑی مشکل سے آنکھ کھول کر بولا ——— "ہاں۔"

کسی نے پوچھا "اب تیرا بھائی اپنے بوٹ تلے کیا کچل رہا ہے؟"

وہ بولا ——— "کتیا کا پلّا۔"

یہ کہہ کر وہ تو سو گیا البتہ لوگ اپنی گٹھڑیاں اٹھا اٹھا کر کتیا کا پلا ڈھونڈنے لگے۔ وہ نہیں ملا اور لوگ چلتے گئے۔ ساتھ سوکھا دریا بھی چلتا گیا۔ راستے میں ہوا کی جو کتنی ہی بار بدلی مگر انہیں پتہ بھی نہ چلا۔

فقیر آباد

میرے مکان کی جو کہانی ہے، پتہ نہیں اسے دلچسپ کہوں یا کیا کہوں۔ میرا مکان اُس جگہ تھا جہاں شہر ختم ہوتا تھا۔ یعنی اس کے بعد چٹیل میدان تھے اور کچھ فاصلے پر پتھریلی پہاڑیاں تھیں۔ لوگ ویرانوں سے گھبراتے ہیں لیکن مجھے گھر کے پچھواڑے یہی ویرانہ اچھا لگتا تھا۔ صبح سویرے اٹھ کر میں چھت پر چلا جاتا اور سورج نکلنے کے منظر کا انتظار کرتا۔ اس دوران سینہ پھلا کر سویرے کی تازہ ہوا اپنے وجود میں اتارتا۔ ہاتھ اِدھر اُدھر پھیلاتا اور ٹانگیں اُچھالتا۔ یوں میری بیوی میرے اس عمل کو ورزش ماننے سے انکار کرتی مگر میرا بلڈ پریشر ٹھیک تھا اور دل کی کسی شریان کے اندر چربی نہیں جمی تھی، میں دعویٰ کرتا تھا کہ یہ میری ورزش کی وجہ سے ہے۔

اور جب میری بیوی اسے 'نام نہاد ورزش' کہتی تو میرے بچے بہت ہنستے۔ یوں بھی وہ اپنے گھر کو میرا ریسٹ ہاؤس کہتے تھے کیونکہ میں گھر پر کم ہی رہتا اور اکثر کاروبار کے سلسلے میں دورے پر رہتا۔ جب میری بیوی کہتی کہ آپ پر دل کا دورہ کیوں پڑے گا، آپ تو کاروبار کے دورے کے مریض ہیں تو بچے ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔

بیوی اپنی پڑوسنوں سے کہا کرتی کہ میرے میاں کبھی کبھار جو گھر آتے ہیں تو اصل میں اپنے میلے کپڑے دینے اور دھلے ہوئے کپڑے لینے آتے ہیں۔ اس پر پڑوسنیں خوب ہنستیں۔

میرے پڑوسی بہت اچھے تھے۔ یہ محلّہ چھوڑنے کا خیال مجھے یوں بھی کبھی نہیں آیا کہ پڑوسی بہت ملنسار اور خوش اخلاق تھے۔ دردمندی تو ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

لیکن میں اُس صبح کا منظر کیسے بیان کروں جب میں اوپر چھت پر گیا، مشرق کی جانب رُخ کر کے کھڑا ہوا کہ طلوعِ آفتاب کے منظر کا کوئی لمحہ دیکھنے سے نہ رہ جائے۔ اس کے بعد میں نے دونوں ہاتھ پھیلائے اور پھیپھڑوں میں تازہ ہوا ایسے بھری جیسے سقّا اپنی مشک بھرتا ہے۔ میں سانس کھینچ کر کافی دیر تک روکے رکھتا تھا، پھر نکالتا تھا۔ اُس روز یہ ہوا کہ زور لگا کر سانس کھینچ تو لی مگر نکالنا بھول گیا۔ آنکھوں کے آگے ایک ایسا منظر تھا کہ سانس نے خود بھی نکلنے کی کوئی خاص خواہش ظاہر نہیں کی۔ وہ منظر یہ تھا کہ عین میری نگاہوں کے سامنے، پچھواڑے کے میدان میں، میری چار دیواری سے ملا کر کسی نے راتوں رات جھونپڑی ڈال لی تھی۔

میں سورج دورج بھول بھال کر نیچے دوڑا۔

"بیوی بیوی غضب ہو گیا۔ گھر کے پیچھے کسی نے جھونپڑی ڈال لی ہے۔"

"کس نے کیا ڈال لی ہے؟" بیوی ہاتھ پونچھتے ہوئے باورچی خانے سے نکل آئی۔

"ہمارے گھر کے پیچھے کسی نے جھونپڑی ڈال لی ہے۔"

"تو پھر؟" بیوی کی جانب سے دنیا کا مختصر ترین سوال آیا۔

میں نے جواب دیا "ایک تو خدا جانے اس میں چور اچکا کون رہے گا ـــــ"

وہ جھٹ بولی "اور دوسرے ـــ؟"

"اور دوسرے یہ کہ آج ایک جھونپڑی پڑی ہے، کل دو پڑیں گی، پرسوں چار، ترسوں آٹھ اور اگلے برس تک یہاں چور اچکوں، غنڈوں لفنگوں کا پورا شہر آباد ہو جائے گا، صبح صبح غلاظت پھیلے گی، گندی نالیاں بہیں گی، دنگے فساد ہوں گے اور سب سے بڑھ کر یہ ـــــ" میں چپ ہو گیا۔

یہ خیال مجھے مارے ڈال رہا تھا۔ میں ٹھہرا کاروباری آدمی اس لیے یہی ایک خیال دوسرے تمام خیالوں پر بھاری تھا۔

"سب سے بڑھ کر کیا ہے؟" بیوی بولی۔

"سب سے بڑھ کر یہ کہ پانچ لاکھ کا یہ مکان کوئی کوڑیوں کے بھاؤ بھی نہیں خریدے گا۔" یہ کہتے کہتے میں پسینے میں نہا گیا۔

بیوی نے مجھے سمجھایا بجھایا، ناشتہ کرایا، جب تک میں نے شیو بنایا وہ صابن کی کٹوری پکڑے میرے برابر کھڑی رہی۔ پھر میرے کپڑے نکال کر دیئے اور کہا کہ اب پڑوس میں جائیے اور وکیل صاحب، قاضی صاحب اور

حکمت یار صاحب سے بات کیجیے۔

میں گیا۔ وکیل صاحب، قاضی صاحب اور حکمت یار صاحب کو آوازیں دیں، وہ تینوں باہر آگئے اور مجھے پریشان دیکھ کر مجھ سے بھی زیادہ پریشان ہوگئے۔

تینوں فرشتہ صفت انسان تھے۔ وکیل صاحب غریبوں کے مقدموں میں فیس لیے بغیر پیروی کرتے تھے۔ قاضی صاحب بقر عید پر قربانی کی کھالیں جمع کر کے مفت شفاخانے والوں کو دیتے تھے اور حکمت یار صاحب غریبوں کے بچوں کو مفت ٹیوشن پڑھاتے تھے۔ میری بات پر انھوں نے کسی تشویش کا اظہار نہیں کیا بلکہ مجھے اطمینان دلانے لگے۔ کہنے لگے کہ وہ جو حسین شاہ فقیر ہے جو صرف جمعرات اور جمعے کو خیرات مانگتا ہے، اس نے اور اس کی بیوی نے ایک چھوٹی سی جھونپڑی ڈال لی ہے۔ دونوں غریب ہیں۔ جمن شاہ کے تکیے میں لکڑی کے ٹال کے پچھواڑے رہتے تھے۔ وہاں پرانی قبروں سے بچھو بہت نکلنے لگے تھے اس لیے بیچارے اٹھ کر یہاں آگئے ہیں۔ بالکل مسکین ہیں۔ خاموشی سے رہیں گے، آپ کو کچھ نہیں کہیں گے بلکہ پیچھے کی طرف سے دیواریں پھاند کر آنے والے چوروں کی آمد و رفت بھی رک جائے گی۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ یہاں ایک غریب کو جھونپڑی ڈالنے کی اجازت دیں گے، وہاں آپ کو محل ملے گا۔ وکیل صاحب نے اس میں اضافہ کیا کہ ہر محل کے ساتھ چالیس چالیس حوریں بھی ملیں گی۔ قاضی صاحب نے انکشاف کیا کہ ہر حور کے بدن پر بیک وقت چالیس چالیس لباس ہوں گے اور حکمت صاحب نے یہ مژدہ سنایا کہ وہ لباس اتنے

نفیس اور اتنے مہین ہوں گے کہ ان کی آڑ سے حوروں کا بدن جھلکے گا۔

میں پلٹ کر دوبارہ چھت پر گیا۔ سورج طلوع ہو رہا تھا اور عین میری نگاہوں کے سامنے جھاڑیوں کی آڑ سے حسین شاہ کی کالی کلوٹی بیوی کا بدن جھلک رہا تھا اور کوئی میرے کانوں میں کہے جا رہا تھا کہ یہ تو ہر صبح جھلکے گا۔ میں کہنے والے پر لاحول بھیجتا ہوا چھت سے نیچے اتر آیا۔

اگلی صبح میں اپنے ٹھیکے دار کا کام دیکھنے دبئی چلا گیا۔ آٹھ دس روز بعد لوٹ کر آیا اور گھر میں سامان رکھتے ہی اور ٹائی کھولتے ہی چھت پر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک قطار میں درجن بھر سے زیادہ جھونپڑیاں پڑ چکی ہیں اور دوسری قطار میں بہت سارے بھکاری شہر کی طرف چلے جا رہے ہیں۔

عین اسی وقت خون نے سر کی طرف زور مارا اور دل کی شریانوں میں گرہیں پڑتی محسوس ہوئیں۔ بیوی نے کہا کہ ڈاکٹر کو بلائیے مگر میں اڑ گیا کہ عبدالمجید کو بلایا جائے جس کی دکان کے بورڈ پر بڑا بڑا لکھا ہے، ہر قسم کی جائیداد کی خرید و فروخت کا بہترین مرکز، پروپرائٹر عبدالمجید۔

عبدالمجید کو فون کیا گیا۔ وہ ذرا دیر میں اپنی سوزوکی وین میں بیٹھ کر گیٹ پر آگیا اور یہ جاننے سے پہلے ہی کہ اسے کیوں بلایا گیا ہے، ایڑیاں اٹھا اٹھا کر میرے مکان کا جائزہ لینے لگا۔

میں نے کہا پانچ لاکھ — وہ بولا چار لاکھ۔

میں نے کہا کہ ایک پیسہ کم نہیں لوں گا۔

اس نے کہا کہ فوراً بیچئے ورنہ پچھوارے جھونپڑیوں کی کالونی بن جائے گی اور پھر اتنے پیسے بھی نہیں ملیں گے۔ میری بیوی نے کہا "مجید صاحب! خدا کے لیے جلدی کوئی گاہک ڈھونڈیئے" میں بعد میں بیوی پر خفا ہُوا کہ اس نے مکان بیچنے کے سلسلے میں اتنے اضطراب کا اظہار کیوں کیا، اب عبدالمجید یہ قیمت اُور کم کر دے گا۔ اور عبدالمجید پر ناراض ہُوا کہ ہم جتنی بار گاہک کہتے تھے، وہ اتنی ہی مرتبہ گراہک کہتا تھا۔

کمبخت مکان کی قیمت اور زبان کی وقعت ایک ساتھ گرا رہا تھا۔

اس کے بعد جو چیز گری وہ مکان کی وقعت تھی۔ میں مکران کے ساحل پہ بننے والے بجلی گھر کا معائنہ کر کے واپس آیا اور ٹائی کھولتا ہُوا چھت پر چڑھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ پیچھے میدان میں جھونپڑیاں اس شان سے ڈالی گئی ہیں کہ ان کے درمیان ایک مین روڈ ہے اور دونوں جانب بغلی سڑکیں ہیں جن پہ بھکاریوں کے بچے کرکٹ کھیل رہے ہیں اور ایک گداگر اپنی پھیری پر جانے کی بجائے امپائر بن کر کھڑا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ وہی انگلی اٹھا کر آؤٹ بھی دے رہا ہے جو انگلی اٹھا کر ٹریفک لائٹ والے چوراہے پر ایک روپے کا سوال کیا کرتا ہے۔

یہاں تک تو مکان کی وقعت گری۔ اس کے بعد مجھ پہ بجلی گری۔ جھونپڑیوں کے بیچوں بیچ چلی جانے والی چوڑی سڑک پر ایک بڑا سا بورڈ لگا تھا اور اس پہ بڑے بڑے حرفوں میں لکھا تھا، فقیر آباد۔

میں جہاں کھڑا تھا وہیں بیٹھ گیا اور بیوی کو زور زور سے آوازیں

دینے لگا۔ وہ ننگے سر ننگے پاؤں دوڑتی ہوئی آئی اور کہنے لگی "ڈاکٹر کو بلاؤں؟" میں نے کہا "گولی مارو ڈاکٹر کو اور فوراً ہی ہر قسم کی جائیداد کی خرید و فروخت کے بہترین مرکز کو فون کرو اور پروپرائٹر عبدالمجید کو بلاؤ۔"

عبدالمجید اس بار ذرا تاخیر سے اور نئی شان سے آیا۔ اس کی سوزوکی وین میں اس کے پہلو میں میرے مکان کا گاہک بھی بیٹھا تھا۔ پان کھاتے کھاتے گاہک کے دانتوں پہ کتھے کی جو تہیں چڑھ گئی تھیں انہیں دیکھ کر میں نے طے کر لیا کہ میں بھی اُسے گراہک کہوں گا۔ اور جب اس کے گجراتی لہجے میں یہ بھی سن لیا کہ وہ اس مکان کے ڈھائی لاکھ روپے سے زیادہ نہیں دے سکتا تو وہ گولی جو ڈاکٹر کو مارنے کا مشورہ دیا تھا جی چاہا اس پر داغ دوں۔

لیکن پھر خیال آیا کہ اُس نے صرف جھونپڑیاں دیکھی ہیں اور شاید فقیر آباد کا بورڈ اس کی نظر سے نہیں گزرا اس لیے موقع کو غنیمت جانتے ہوئے میں نے اپنے مکان کی قیمت چار لاکھ سے گھٹا کر ساڑھے تین لاکھ کر دی لیکن وہ ڈھائی لاکھ پہ اَڑا رہا۔ میں نے بھی اسے جلدی سے رخصت کر دیا تاکہ منہ میں دبے ہوئے پان کی اگلی پیک باہر سڑک پر جا کر تھوکے۔ اس بار تو میری بیوی نے بھی میری حمایت کی اور کہا کہ اتنا اچھا مکان بھلا کوئی ڈھائی لاکھ میں بیچ سکتا ہے۔

میں چپلیں اتار کر، ٹانگیں پھیلا کر، دونوں ہاتھ صوفے کی دونوں جانب جھلاتے جھلاتے وہیں دراز ہو گیا اور میری آنکھ جو لگی تو خواب میں کیا دیکھتا

ہوں کہ حسین شاہ اور اس کی کلثوم میرے پاس آئے ہیں اور کہہ رہے ہیں
کہ اگر یہ مکان ڈھائی لاکھ میں بیچنا ہے تو اُس پنواڑی کو نہ دیجیے گا ڈھائی
لاکھ تو ہم بھی دے سکتے ہیں۔ یوں بھی پہلا حق پڑوسی کا ہوتا ہے۔

میں بوکھلا کر اٹھ بیٹھا کیونکہ شام کی فلائٹ سے مجھے اپنے عرب اسپانسر
سے بات چیت کرنے مسقط جانا تھا۔

عرب حسب عادت ٹال مٹول کرتے رہے۔ وہ مافیہ مافیہ کہتے رہے،
میں معافی معافی سمجھتا رہا۔ بڑی مشکل سے ملاقات اور مذاکرات کی نوبت
آئی معاملات طے کرکے واپس آتے آتے دو ہفتے سے زیادہ لگے۔

گھر آتے ہی میں نے سوٹ کیس ایک طرف پٹخا اور ٹائی کی گرہ کھولے
بغیر ہی چھت کی طرف لپکا۔ اوپر جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ فقیر آباد میں خوب
چہل پہل ہے۔ سبزی ترکاری والے اپنی پھیری پر نکلے ہوئے ہیں، ردی
پیپر والے آوازیں لگاتے پھر رہے ہیں۔ ایک نکڑ پر ایک موچی بیٹھا ہے اور
دوسرے پر پرچون کی دکان کھل گئی ہے۔ ایک نسبتاً پختہ عمارت پر بہت
لمبا سا بورڈ لگا ہوا ہے جس پر اس سے بھی زیادہ لمبی عبارت لکھی ہے۔
"قومی انجمن سائلان، گداگران، مساکین و فقراء" اسی عمارت کی نیم پختہ دیوار
پر کسی نے سیاہ روغن کے اسپرے سے لکھا ہے: فقیروں کو بھکاری کہنے
والوں کا منہ کالا۔

یہاں تک بھی غنیمت تھا، لیکن جو منظر دیکھ کر میری روح میرے
بدن سے پرواز کرنے کے لیے مچل گئی وہ یہ تھا کہ فقیر آباد کی مین روڈ پر

ایک بینک کی شاخ کھل گئی ہے جس میں پیسہ جمع کرانے والے بھکاریوں...
میرا مطلب ہے فقیروں کی قطار لگی ہوئی ہے اور جس کھڑکی سے پیسہ نکلوایا
جاتا ہے وہاں بیٹھا ہوا کلرک ایک مہذب رسالے کے اندر چھپا کر ایک
ناشائستہ رسالے کی تصویریں دیکھ رہا ہے۔

میں اُتر کر نیچے آیا اور عبدالمجید کو فون کرکے بتایا کہ وہ اپنے پنواڑی
گاہک سے کہہ دے کہ میں اپنے مکان کے تین لاکھ روپے لینے کے لیے
تیار ہوں۔ ذرا دیر بعد اس کا جواب آیا کہ اس کا گاہک ڈھائی لاکھ سے
ایک ٹیڈی پیسہ جاستی دینے کے لیے تیار نہیں۔

میری بیوی نے بڑے غور سے مجھے دیکھا اور آنکھوں آنکھوں میں
پوچھا کہ کیا کہتے ہو؟

"میرا جواب صاف ہے۔ تین لاکھ سے ایک پیسہ کم نہیں لوں گا"
یہ کہا اور ٹیلی ویژن کے آگے صوفے میں دھنس گیا اور بچوں کو حکم دیا کہ
وی سی آر پر ہندوستانی فلم زخمی عورت لگا دیں۔ بچوں نے حیران کر پوچھا:
کیوں؟ میں نے جواب دیا کہ جب ذلیل ہونا ہی ہے تو اچھی طرح ہوں۔
دن گزرتے گئے۔ گھر کے پچھواڑے کھلنے والی کھڑکیاں کس کر بند کر
دی گئیں مگر ادھر سے آنے والا شور بھی بڑھا، بدبو بھی اور مکھیاں بھی۔
سپر ہائی وے کی تعمیر پر ہونے والے اپنے کام کے معائنے کے لیے
میں چار دن کے خیال سے نکلا لیکن بارہ دن تک ہائی وے اتھارٹی کے
ڈاک بنگلے میں پڑا رہا کیونکہ وہاں گھر سے زیادہ سکون تھا۔ لیکن پھر بیوی بچوں

کے خیال نے ستایا تو میں نے ڈرائیور کو حکم دیا کہ کار کو اچھی طرح دیر تک دھو کر صاف کرے اور کار آہستہ چلائے تاکہ جتنا وقت فقیر آباد سے دور کٹ جائے اچھا ہے۔

میں گھر پہنچا اور بیوی کے لاکھ منع کرنے کے باوجود چھت پر جا پہنچا۔ اچانک میراجی چاہا کہ چھت پھٹے اور پھر نیچے والے کمرے کا ٹائلوں کا فرش پھٹے اور میں اُس میں ایسا گڑوں کہ کبھی کسی کو پان کی پیک تھوکنے کے لیے بھی میرا نشان نہ ملے۔

اب جو منظر میں نے دیکھا وہ میرے فرشتوں نے بھی نہیں دیکھا ہوگا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ فقیر آباد کے صاحب حیثیت فقیر شہر اور مسجد کی طرف سے لوٹ کر آرہے ہیں۔ ان میں حسین شاہ اور اس کی کالی کلوٹی بیوی بھی ہے۔ میں نے دیکھا کہ حسین شاہ اور اس کی بیوی کے پیچھے پیچھے بھکاریوں کے بچوں کی ٹولی ہاتھ پھیلائے چلی آرہی ہے اور اس کے دامن کھینچ کھینچ کر کہہ رہی ہے "بابا، اللہ تمھاری جوڑی بنائے رکھے۔ اماں، اللہ تمھارا سہاگ قائم رکھے۔"

اور صرف یہی نہیں۔

میں نے دیکھا کہ حسین شاہ بچوں کو گھر کتا جارہا ہے اور کہتا جارہا ہے۔ "معاف کرو، معاف کرو۔ آگے جاؤ، آگے جاؤ۔" اور حسین شاہ کی بیوی کہہ رہی ہے "تمھیں شرم نہیں آتی مسٹنڈو، جاؤ محنت مجوری کرو۔"

میں نے اپنا دل تھام لیا۔ نہ بیوی کو پکارا، نہ عبدالمجید کو صدا دی بلکہ

چھت کی منڈیر پر اپنا پورا وزن ڈالا یہاں تک کہ آدھا باہر کو لٹک گیا اور پھر اپنا حلق پھاڑ کر چلایا "کمبختو، بھکاریو! یہاں جھونپڑیاں ڈال کر میرے پانچ لاکھ کے مکان کو تم نے تباہ کر دیا۔ ٹھیک ہے۔ میں نے بھی فیصلہ کر لیا ہے میں نے طے کر لیا ہے کہ اپنا یہ شاندار مکان صرف اور صرف ڈھائی لاکھ روپے میں بیچ دوں گا۔"

پھر اپنے طنز کے آخری تیر چلاتے ہوئے میں نے نیلامیوں کی طرح پہلے ایک انگلی اٹھا کر کہا "ڈھائی لاکھ ایک۔"

پھر دوسری انگلی اٹھا کر کہا "ڈھائی لاکھ دو۔"

اور پھر تیسری "ڈھائی لاکھ تین۔"

یہ کہہ کر میں نیچے اترنے لگا۔ میری بیوی اور تینوں بچے حیرت سے منہ کھولے اور تعجب سے آنکھیں پھاڑے دالان میں کھڑے اوپر کی طرف دیکھ رہے تھے۔

میں نیچے اترا تو ٹیلی فون کے ڈائل میں ڈالنے کے لیے اپنی شہادت کی انگلی سیدھی کیے ہوئے۔ ابھی میں بچوں سے کہنے ہی والا تھا وی سی آر پر ریمبو کی فلم لگا دیں کہ اچانک باہر گیٹ پر دستک ہوئی۔

چھوٹی بیٹی بولی "میں جاتی ہوں۔"

منجھلا لڑکا چلایا "نہیں۔ دوپہر کو گیٹ تم نے کھولا تھا۔ اب میری باری ہے۔"

بڑے نے شور مچایا "تین دن سے ہر دستک پر تم دونوں دوڑ رہے

ہو۔ آج میری باری ہے۔"

"نہیں —" میں غصے سے چلایا۔ "بھکاریوں کی طرح شور مت مچاؤ۔ اس وقت صولت جائے گی۔ وہ سب سے چھوٹی ہے۔ جاؤ صولت دیکھو گیٹ پر کون ہے؟ —"

صولت ننگے پاؤں تھی۔ وہ ویسے ہی گئی اور ذرا دیر بعد لوٹ آئی اور میرے سامنے کھڑے ہو کر دونوں پیروں کے تلوے اندر کی جانب موڑتے ہوئے اور قمیص کے گلے میں ہاتھ ڈال کر اپنی پیٹھ کو بلا سبب کھجاتے ہوئے بولی "ابا ابا، وہ آئے ہیں۔ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"کون؟ —"

"وہ — حسین شاہ اور اُس کی بیوی۔"

میری نگاہوں میں وکیل صاحب، قاضی صاحب اور حکمت یار صاحب کی حور شمائل صورتیں اور ذہن میں ان کی فرشتہ صفت باتیں گھوم گئیں اور میں نے صولت سے کہا "انھیں اندر بلا لو —"

تنہائی کے ساتھی

سورج کو اتنا تنہا میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ اور یہ بات شاید یک طرفہ نہ تھی۔

جون کا مہینہ تھا۔ دن بہت لمبے ہو چکے تھے اور گیسٹ ہاؤس میں جس وقت رات کا کھانا کھلایا گیا، باہر دھوپ چمک رہی تھی۔

بھنا ہوا پھیکا گوشت اور اُبلی ہوئی بے مزہ سبزی کھا کر اور کافی پی کر سارے مہمان اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے اور کھڑکیوں کے پردے کھینچ کھینچ کر اندھیرا کرنے لگے۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا تو جھیل جھملا رہی تھی۔ پہاڑ دھوپ میں نہائے کھڑے تھے۔ پتوں پر بھی دھوپ چمک رہی تھی اور پھولوں کی پنکھڑیوں سے چھن رہی تھی تو پنکھڑیاں باریک کاغذ جیسی لگ رہی تھیں۔ بھیڑیں سر جھکائے گھاس چرے جا رہی تھیں۔ بطخیں اُڑ رہی تھیں۔ معلوم نہیں اُتر رہی تھیں یا اُڑ کر کہیں اندھیرے کی تلاش میں جا رہی تھیں۔

سامنے سبز میدان میں کیمپنگ کرنے والوں نے اپنے اپنے خیموں کے باہر گیس کے چھوٹے چھوٹے چولہے جلا رکھے تھے۔ کوئی پتیلی میں اپنا کھانا گرم

کر رہا تھا اور کوئی دودھ ابال رہا تھا جس سے سفید سفید بھاپ اُٹھ رہی تھی۔ ایک عورت زمین پر اخبار پھیلائے اسے پڑھتی جا رہی تھی اور پتیلی میں چمچہ چلائے جا رہی تھی۔ اس کا کتا اونگھنے لگا تھا اور چمکتی دھوپ میں آنکھیں موندے لیٹا تھا۔

برابر کے کمروں میں ٹھہرے ہوئے مہمان شب خوابی کے لباس بدل رہے تھے، دانتوں کو برش کر رہے تھے اور دبی آواز سے غرارے کر رہے تھے کہ کہیں پڑوسیوں کے آرام میں خلل نہ پڑے۔ ٹیلی ویژن پر رات کی خبریں شروع ہو چکی تھیں اور کھڑکی کے راستے کمرے کے اندر آنے والی دھوپ چینی کے واش بیسن پر چمک رہی تھی۔

اپنے کمرے کی تنہائی میں میرا جی گھبرایا اور میں نے میز کی دراز کھول کر کار کی چابی نکالی، ہلکا سا کوٹ پہنا اور گیسٹ ہاؤس سے باہر نکل آیا۔ درختوں کے جھنڈ خاموش کھڑے تھے۔ سبزہ زاروں پر دھوپ یوں گر رہی تھی جیسے گھاس کو بے وقت کا اجالا ناگوار گزر رہا ہو۔

میں نے گیسٹ ہاؤس کا گیٹ کھولا اور کار اسٹارٹ کی، اس سناٹے میں یوں لگا جیسے کوئی توپ داغ دی گئی ہو۔ میں نے کار گیٹ سے باہر نکالی، اتر کر گیٹ دوبارہ بند کیا اور کار میں بیٹھ کر اس کا دروازہ آہستہ سے بند کیا کہ کہیں گھاس پر جھکی ہوئی بھوری بھیڑوں کے سیاہ فام میمنے اس سکون کے لمحے میں دروازے کی آواز سے ڈر کر ماؤں کی طرف نہ دوڑ پڑیں۔

کار چلی اور چھوٹی سی سڑک سے نکل کر پہاڑی درے کی اُس سے بھی

چھوٹی سڑک پر آ گئی۔ اب میری دونوں جانب پہاڑ تھے جن پر سبزہ یوں اُگا تھا جیسے دو تین دن کا بڑھا ہوا شیو۔

سڑک کی دونوں جانب چشمے بہہ رہے تھے جو کہیں تو سبزے میں روپوش ہو جاتے اور کہیں کہیں نمودار ہو کر دھوپ میں چمکتے تو محسوس ہوتا جیسے زمین پر روشنی کے پھاہے رکھے گئے ہوں۔ کار ذرا بلندی پر گئی تو پوری جھیل نظر آنے لگی۔ دوپہر کو میں اونچے بوٹ پہن کر اسی جھیل کے گرد چلا تھا تو کنارے کنارے چلنے والی پگڈنڈیوں پر تتلیاں میرے ہمراہ اڑی تھیں، بچے تتلیاں پکڑنے کے جال لے کر دوڑ رہے تھے اور والدین انہیں پانی سے دور رہنے کی ہدایت کر رہے تھے۔ اونچے اونچے نیکر پہنے، پیٹھ پر چھوٹے تھیلے لادے، ہاتھوں میں پگڈنڈیوں کے نقشے لیے لوگ مختلف منزلوں کو چلے جا رہے تھے۔ ان میں سے کتنے ہی اچھے خاصے ضعیف تھے مگر جھیل کی ہوا اور دھوپ کی حرارت سے توانائی لے کر وہ یوں چل رہے تھے کہ سب سے آگے نکلے جا رہے تھے۔

نوجوان لڑکے لڑکیاں ہاتھ تھامے پہاڑ پر وہاں چلے گئے تھے جہاں پہاڑی چشمہ جھرنا بن کر گر رہا تھا اور چھوٹے چھوٹے پُلوں کے نیچے سے گزرتا اور بڑی بڑی چٹانوں سے بچتا بچاتا جھیل کا پیالہ بھر رہا تھا۔ راستے میں کہیں کہیں درختوں کے جھنڈ آ جاتے تو راستہ دو پگڈنڈیوں میں تقسیم ہو جاتا، جو چاہے وہ درختوں کے جھنڈ سے گزرے اور جس کا جی چاہے جھیل کے کھلے کھلے کناروں پر چلے۔ اکثر نوجوانوں نے جھنڈ والا راستہ چنا تھا جس میں تنہا

تھا، کنارے پر چلنے لگا۔ کشتیوں کے بادبان اپنا رنگ پانی میں گھول رہے تھے۔ کچھ لوگ ربڑ کی ڈنگیوں میں دھنسے چپو چلا رہے تھے اور ہانپ ہانپ کر اپنے ساتھیوں سے باتیں کر رہے تھے۔ جھیل کی سطح کے سناٹے نے ان کا کوئی راز راز نہیں رہنے دیا تھا۔

میں راہ میں قدم قدم پہ آنے والے چشموں کو پھلانگتا اور کالج کے زمانے کے پرانے گانے گنگناتا چلا جا رہا تھا اور ان لوگوں کی جرأت کو داد دے رہا تھا جو جھیل کے کنارے سر اٹھائے پہاڑ کی چوٹی کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر چڑھ رہے تھے، ان میں بڑے بھی تھے اور بچے بھی اور ان کی رفتار کا یہ عالم تھا کہ ابھی نیچے نظر آتے تھے، ذرا دیر بعد چوٹی کے قریب دکھائی دینے لگتے تھے۔ یہ پگڈنڈی پہاڑ کی دوسری طرف اتر کر کہیں چلی جاتی تھی۔ بعد میں کسی نے بتایا تھا کہ دوسری طرف اس سے بھی زیادہ خوبصورت علاقہ ہے۔

ان ہر طرف پھیلے ہوئے لوگوں میں ایک بات مشترک تھی۔ وہ جو کچھ بھی کر رہے تھے اس کے ساتھ وہ سب شفاف آسمان پر چمکنے والے سورج کے نور کو اپنی روح اور اپنے بدن میں اتار رہے تھے۔ سورج اس وقت کتنا مسرور نظر آ رہا تھا اور کیسی فراخدلی سے اپنی سونے جیسی دھوپ لٹا رہا تھا۔ الگنیوں پر لٹکے ہوئے کپڑے اس روز قدرتی حرارت سے سوکھے تو زیادہ ہی صاف محسوس ہوئے۔ لوگ اپنی کھانے کی پلیٹیں اٹھائے باہر نکل آئے تھے اور لکڑی کی بنچوں پر بیٹھے دھوپ میں کھانا کھا رہے تھے۔ پسینہ میری

دونوں قلموں سے بہہ نکلا تھا اور مجھے اپنے ہاتھوں کی جلد سرخ ہوتی نظر آ رہی تھی۔

اسی جھیل کو اب جو دیکھا تو ساکت سی نظر آئی۔ بادبانی کشتیاں درختوں کے نیچے، جھاڑیوں کے پچھواڑے تاریک گوشوں میں جا چکی تھیں۔ جھیل کے گرد پگڈنڈیوں پر اور درختوں کے جھنڈوں میں سناٹا تھا اور پہاڑ پر چڑھ کر دوسری طرف اترنے والی پگڈنڈی، جہاں لوگوں کی قطاریں چڑھتی نظر آ رہی تھیں، اب سونی پڑی تھی۔ الگنیوں سے کپڑے اتار لیے گئے تھے۔ کھڑکیوں پر پردے تان دیئے گئے تھے اور وہاں اوپر نیلے آسمان میں سورج تھا کہ چھپے جا رہا تھا۔

میری کار درے سے اتر کر نیچے وادی میں آ گئی۔ سوچا تھا وہاں اندھیرا ہو چکا ہوگا مگر روشنی پہاڑی ڈھلانوں سے اتر رہی تھی۔ میں واپس اپنے کمرے میں آیا اور کھڑکی سے باہر دیکھا۔ سورج اس بچے جیسا لگا جو چار دیواری پر ٹھوڑی ٹیکے پڑوس کے بچے کو دیکھا کرتا ہے۔

خدا جانے کب میں لیمپ بجھا کر سو گیا۔

اگلی صبح گیسٹ ہاؤس کے سارے مہمان ناشتے کی میز پر ملے۔ جو اخبار نہیں پڑھ رہے تھے وہ باتیں کر رہے تھے۔ میرے برابر والے کمرے کے بوڑھے میاں بیوی ناشتے کے کمرے میں داخل ہوئے تو گڈ مارننگ گڈ مارننگ کی آوازیں بلند ہوئیں۔

دونوں آ کر میرے برابر بیٹھ گئے۔ میں نے خاص ان ہی کے انداز میں

پوچھا "رات آرام سے سوئے؟"

وہ اپنے انداز میں بولے "ہاں۔ شکریہ — اور تم؟ —"

میں نے کہا "مجھے ذرا مشکل سے نیند آئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے سورج کو ڈوبنے میں دشواری ہو رہی تھی۔"

میری یہ بات سن کر بڑھیا بولی "کیا تم یقین کرو گے کہ ہم دونوں بھی یہی دیکھ رہے تھے۔ سورج ڈوب نہیں رہا تھا۔ لیکن پتہ ہے پھر کیا ہوا؟ جیسے ہی تمہارے کمرے کی روشنی بجھی وہ ڈوب گیا۔"

وزیبلٹی زیرو

اس بستی کا نام بھولے جی تھا۔ جیسا اس کا نام تھا ویسے ہی بستی کے رہنے والے تھے۔ اتنے بھولے کہ ایک روز ایک اجنبی نوجوان ٹرین سے اتر کر گاؤں میں آیا تو کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کسی نوجوان کو ان کی بستی کی کیا ضرورت؟

عورتوں نے آدھے منجھے ہوئے برتن چھوڑے۔ بچوں نے گھومتے لٹو اور دوڑتے پہیئے گر جانے دیئے۔ مردوں نے سریش کے کڑھاؤ کے نیچے سلگتی آگ ویسے ہی جلتی چھوڑ دی اور چہار جانب سے چلتا ہوا یہ چھوٹا سا مجمع جوان کے گرد جمع ہو گیا۔

جب تک ریل گاڑی کے انجن سے نکلتی بھاپ شور مچاتی رہی اور پھر چھوٹتی ہوئی ٹرین کے پہیئے پٹریوں کے جوڑوں پر ٹھوکریں مار مار کر لوہے کو لوہے سے بجاتے رہے، ساری آبادی نوجوان کی آنکھوں کے اندر جھانکتی رہی۔ اور جب دور جاتی ہوئی گاڑی چھوٹی سی رہ گئی، پٹریوں کی ٹھن ٹھن بند ہو گئی اور صرف دریا کا ہلکا ہلکا شور اور کڑھاؤ میں اٹھتے ہوئے بلبلوں کی آوازیں رہ گئیں تو کسی کو خیال آیا کہ بات کرنے کا وقت آ پہنچا ہے۔

کئی لوگوں نے اللہ بچایا سے کچھ کہا۔ شاید یہ کہا کہ نوجوان سے پوچھو کر

تم کیوں آئے ہو۔

اللہ بچایا نے پوچھا، تم کیوں آئے ہو؟

نوجوان نے کہا ــــ میں بیکار پڑے ہوئے ہوائی اڈوں پر اپنی تحقیق کرنے نکلا ہوں۔

اللہ بچایا نے گردن یوں ہلائی جیسے پوری بات سمجھ گیا ہو اور پھر بستی والوں کے سپاٹ چہروں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "یہ لڑکا کہتا ہے کہ بیکار پڑی ہوئی ہڈیوں سے اسے قے آتی ہے۔"

اس جواب سے بستی والے مطمئن ہو کر اپنے اپنے کاموں کو لوٹ گئے۔ لڑکے ٹنٹو گھمانے لگے اور چھپے دوڑانے لگے۔ مرد دہکتے چولہوں پر جا کر سریش پکانے لگے اور عورتیں برتن مانجھنے لگیں اور بانہوں میں چہرے چھپا کر کھلکھلانے لگیں کیونکہ قے کی بات سن کر اللہ وسائی نے کہہ دیا تھا کہ کہیں نوجوان کے پیٹ میں بچہ تو نہیں؟

یوں بھی بھولے جی میں بیکار ہڈیوں کا کیا کام۔ وہاں تو مردہ جانوروں کی کھالیں آیا کرتی تھیں۔ پرانی فوجی بیرکوں کے کھنڈروں میں بڑے بڑے چولہوں پر کڑھاؤ چڑھے رہتے تھے اور ان میں کھالیں ابلتی رہتی تھیں۔ لوگ ان سے اٹھنے والی بدبو کے عادی ہو چکے تھے۔

جب کبھی تبدیل ہو کر کوئی نیا اسٹیشن ماسٹر آتا تھا، بس وہ چند روز بدبو کی شکایت کرتا تھا، پھر وہ بھی خاموش ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کہ شہر کے قصائی چھکڑوں پر لاد کر کھالیں لاتے تو ان سے اٹھنے والی بدبو اور ان پر

بھنکنے والی مکھیوں پر بھی کوئی دھیان نہیں دیتا تھا۔ صرف گاؤں کے کتوں کو فکر ہوتی تھی کہ کڑھاؤ چڑھنے سے پہلے منہ مار لیں تو شاید کچھ پیٹ میں جائے۔

جن بیرکوں کے کھنڈروں میں کڑھاؤ چڑھتے تھے یہ انگریزوں نے دوسری عالمی جنگ کے زمانے میں اپنی ہوائی فوج کے لیے بنوائی تھیں اور ان کے پچھواڑے خاردار تاروں کی دوسری طرف رن وے بنا تھا جس پر وہ ایک ایک اور دو دو پنکھوں والے ہوائی جہاز اتارا کرتے تھے۔ بھولے جی کی بستی یہاں پہلے سے ہوگی اس لیے انگریزوں نے اپنی فضائی چھاؤنی کا نام بھولے جی کیمپ رکھ دیا اور اسی نام سے اسٹیشن بھی بنوا دیا جس کے پلیٹ فارم پر کٹی ہوئی اینٹوں کی سرخ بجری اب تک بچھائی جاتی تھی، دیواروں پر سفیدی اب تک ہوتی تھی اور جالی دار کمانی والے دروازوں پر مٹی روغن کی موٹی تہیں آج تک چڑھائی جا رہی تھیں جو اب یوں تڑخ گئی تھیں جیسے برسوں سے سوکھی ہوئی جھیل کی چٹیل تہہ۔ موٹی موٹی کھرانی دیواروں کے برآمدوں میں اب سناٹا پڑا تھا۔ ریلوے لائن کی ایک شاخ الگ ہو کر کنارے کو چلی گئی تھی جو آگے جا کر ختم ہو جاتی تھی۔ اس جگہ پٹری کے اوپر خشک مٹی کا بڑا سا انبار لگا دیا گیا تھا کہ ٹرین اگر رکنے نہ پائے تو اس میں دھنس جائے۔ پیچھے دو تین کوارٹر بنے تھے جن میں اسٹیشن ماسٹر اور سگنل مین رہتے تھے۔ بکنگ کلرک اور ٹکٹ چیکر کی اب ضرورت نہیں رہی تھی کیونکہ اکا دکا مسافر ٹرین پر چڑھتے تھے اور اکا دکا ہی اترتے تھے۔ البتہ سگنل مین

اس خیال سے رکھ لیا گیا تھا کہ تعلیم یافتہ اسٹیشن ماسٹروں سے سگنل کا کانٹا اٹھانے اور گرانے کی زور آزمائی نہیں ہو سکے گی۔ اور یوں بھی دن بھر میں صرف ایک پسنجر گاڑی وہاں رکتی تھی، باقی گاڑیاں زناٹے بھرتی گزر جاتی تھیں اور گاؤں کے شریر لڑکے گزرتی گاڑیوں کی طرف رخ کر کے پیشاب کیا کرتے تھے۔ ان میں سے شاید ہی کبھی کوئی لڑکا ریل گاڑی میں بیٹھا ہوا اور شاید ہی کسی نے دیکھا ہو کہ رات کو جب گاڑی چلتی ہے تو چاند بھی اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔

جو لڑکے اب اتنے سیانے ہو گئے تھے کہ زناٹے بھرتی گاڑیوں کے مسافروں سے شرمانے لگے تھے وہ بڑی ہمت کر کے اجنبی نوجوان کے گرد جمع ہو گئے۔ نوجوان نے ایک سے پوچھا "تمہارا کیا نام ہے؟"

لڑکا بولا "تمہارا کیا نام ہے؟"

نوجوان مسکرایا کہ گفتگو کا آغاز تو ہوا "میرا نام جلیل ہے ـــ"

یہ تو سنا تھا کہ بیماری اور وبا ہی اڑ کر لگتی ہے، اُس روز مسکراہٹیں اُڑ کر لگیں۔ گاؤں کے سارے لڑکے کھلکھلا دیئے اور ہر ایک اپنا اپنا نام بتانے لگا۔

ایک لڑکے نے جلیل سے پوچھا: گاؤں میں کیوں آئے ہو؟

اُس نے کہا: نقشہ بنانے۔

دوسرے لڑکے نے کہا: نقشہ کیا ہوتا ہے؟

جلیل نے ایک سوکھی لکڑی اٹھائی اور مٹی پر نقشہ بنا کر دکھانے لگا:

"یہ دیکھو، یہ ریلوے لائن ہے۔" اس نے دو لمبی سی متوازی لکیریں کھینچیں اور پھر بہت سی سلیپریں بنائیں۔

"اور دیکھو، یہ اسٹیشن ہے۔" یہ کہہ کر جلیل نے ریلوے لائن کے برابر ایک چوکور خانہ بنا دیا۔ پھر اس نے کئی بیرکیں بنائیں۔ اس کے بعد لمبا سا رن وے بنایا۔ پھر سر اٹھا کر ادھر اُدھر دیکھا۔ ریلوے لائن کی دوسری طرف دریا کی جانب اُسے دور دور تک پھیلی ہوئی ہریالی کے درمیان ابھرا ہوا ایک بڑا سا خشک اور بنجر سا ٹیلہ نظر آیا۔ جلیل نے مٹی پر ریلوے لائن کی دوسری جانب انڈے جیسی شکل بنائی اور کہا "یہ دیکھو۔ یہ وہ ٹیلہ ہے۔"

جلیل کا یہ کہنا تھا کہ لڑکوں کے ہجوم میں خوف سا دوڑ گیا۔ ان میں سے کچھ تیزی سے جھپٹے اور اپنے کالے کالے میلے میلے پیروں سے ٹیلہ مٹانے لگے۔ جلیل حیران کھڑا دیکھ رہا تھا۔ چھ سات لڑکے جلدی جلدی ٹیلہ مٹا رہے تھے۔ گرد کے بادل اٹھ رہے تھے اور ریلوے لائن اور اسٹیشن کی عمارت کے اوپر ہوتے ہوئے رن وے پر اس بری طرح چھا رہے تھے کہ دنیا ہی بری ہو گئی تھی۔ جلیل کا دم گھٹنے لگا۔

"یہ کیا کر رہے ہو، یہ کیا کر رہے ہو؟ ـــ" وہ چلّایا۔

لڑکوں نے اس کی طرف دیکھا مگر کوئی جواب نہ دیا۔ جلیل کو اُن میں سے نور محمد کا نام یاد رہ گیا تھا۔ اُس نے کہا "نور محمد، یہ کیا کر رہے ہو۔ ٹیلے کو کیوں مٹا رہے ہو؟"

"ٹیلہ منحوس ہے۔" نور محمد چلّایا۔ اُسے یہ لفظ اچھی طرح معلوم تھا۔

اتنے میں گرد کے پیچھے سے اللہ بچایا نمودار ہوا۔ جلیل نے اس سے کہا ـــــ

"اللہ بچایا۔ یہ لڑکے کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ سامنے والا ٹیلہ منحوس ہے؟ ـــ"

جواب ملا اور مفصّل ملا "ہاں، وہ ٹیلہ منحوس ہے۔ کوئی آدمی اُس پہ چلا جائے تو اُسے لقوہ ہو جاتا ہے۔ ایک لڑکا اُدھر گیا تھا وہ اندھا ہو گیا۔ ایک عورت گئی تھی اُس کے پیٹ سے بڑا سا پتھر پیدا ہوا۔ بہت منحوس ہے وہ ٹیلہ۔ دیکھو، کیسا بنجر اور ویران ہے۔ ہم سب کو بہت نفرت ہے اُس ٹیلے سے۔"

اب گرد بیٹھ چکی تھی۔ لڑکوں کے چہرے صاف نظر آنے لگے تھے۔ جلیل نے اُن سے پوچھا "تمہیں بھی نفرت ہے اُس ٹیلے سے؟"

کئی آوازیں آئیں۔ ایسی نوجوان آوازیں جو ابھی پوری طرح بھاری نہیں ہوئی تھیں "ہاں۔ نفرت ہے۔"

کچھ دور اللہ وسائی کھڑی تھی۔ پیرانہ سالی میں اس کا سارا بدن ڈھیلا ہو کر لٹک گیا تھا۔ کچھ جوان لڑکیاں اُس کی آڑ سے جھانک رہی تھیں اور ٹیلے کو کم، جلیل کو زیادہ دیکھ رہی تھیں۔ جلیل نے اللہ وسائی سے پوچھا "اماں! تمہیں بھی نفرت ہے اُس ٹیلے سے؟ ـــ"

"ہاں بیٹے۔ اس کا نام نہ لو۔ بڑا برا ٹیلہ ہے۔ اور دیکھو بیٹے۔ ہرگز جانا۔ اُس ٹیلے پر نہ جانا۔ جوان جہان ہو۔ تمہیں لقوہ ہو جائے گا۔"

اس پر پیچھے سے جھانکتی ہوئی لڑکیوں نے اپنی گردنیں یوں ہلائیں جیسے آواز ملا کر کہہ رہی ہوں "خدا نہ کرے۔ خدا نہ کرے!"

شام ہونے سے پہلے پہلے گاؤں والوں نے جلیل کو باقاعدہ اپنا مہمان بنا لیا۔ کھانا پکنے لگا۔ کئی جگہ چولہے جلے۔ سلوں پر مسالہ پسنے لگا۔ گاؤں کے شور میں کسی لڑکی کی بات سنائی دی جس میں مہمان کا ذکر تھا۔

اندھیرا ہونے تک گاؤں کے سارے مرد جلیل کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے۔ وہ ہوائی اڈے کا ذکر چھیڑنا چاہتے تھے۔ جلیل نفرت زدہ ٹیلے کی بات کرنا چاہتا تھا۔ وہ گریز کر رہے تھے، یہ اصرار کر رہا تھا۔ کوئی کہتا تو لیں یہ کہ اُسے ٹیلے سے نفرت ہے اور یہ کہ بیرکیں دیکھو، ہوائی اڈے کا نقشہ بناؤ۔ دوسری طرف پرانے تہ خانے ہیں، ان کے اندر جاؤ۔ کچھ دور ایک جہاز کا ڈھانچہ پڑا ہے، اس کی تصویریں اتارو۔ سارے کام کرنا مگر اُس ٹیلے پر نہ جانا۔

وہ سب بولتے بولتے اچانک خاموش ہو گئے۔ پہلے سناٹا چھایا پھر ریل گاڑی کی پٹڑیوں کو ٹھوکریں سی لگیں، پھر کوئی تیز رفتار گاڑی تیر کی طرح آئی اور تیر ہی کی طرح گزر گئی۔ اس کے ڈبوں کی کھڑکیوں سے نکل کر روشنی نیچے زمین کی اونچ نیچ پر اچھلتی پھاندتی چلی گئی۔

پوری آبادی میں تنہا جلیل تھا جو گزرتی ہوئی ٹرین کو دیکھتا رہا۔ باقی آبادی خود جلیل کو دیکھتی رہی جیسے انتظار کر رہی ہو کہ ٹرین جائے، خاموشی ہو اور جلیل اُس ٹیلے کے بارے میں ان کے تبصرے پر کوئی تبصرہ کرے۔

جلیل نے کلاس روم کے بلیک بورڈ کے قریب کھڑے ہوئے کسی استاد کی طرح کہنا شروع کیا "کوئی ٹیلہ منحوس نہیں ہوتا۔ زمین کا کوئی ٹکڑا قابلِ نفرت

نہیں ہوتا۔ میں نے سینکڑوں ہزاروں کتابیں پڑھی ہیں۔ کسی میں نہیں لکھا ہے کہ ٹیلوں پر جانے سے کوئی اندھا ہو جاتا ہے اور کسی کو لقوہ ہو سکتا ہے۔ ٹھیک ہے کسی ایک آدھ کو کچھ ہو گیا ہوگا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب جو بھی وہاں جائے گا اُسے کچھ ہو گا ضرور ـــــ دیکھو زمانہ بدل گیا ہے۔ یہ علم کا زمانہ ہے، جہالت کی باتیں چھوڑو اور بیچارے ٹیلے کو کچھ نہ کہو۔"

اس نے اتنے بھولپن سے ٹیلے کو بیچارا کہا کہ اللہ وسائی کی آنکھوں سے خون اور لڑکیوں کی آنکھوں سے پیار ٹپکنے لگا۔ ان کے چہروں کی رنگت دیکھ کر لڑکے بھی مسکرانے لگے۔

اب اللہ بچایا کے بولنے کی باری تھی۔ اس نے ایک ذرا سی بات پوچھی۔ "اچھا یہ بتاؤ کہ ٹیلہ منحوس نہیں ہے تو پھر یہ بنجر کیوں ہے؟ اتنے ہرے بھرے علاقے میں دریا کے اتنے پاس ہو کر بھی یہ سوکھا ہوا کیوں ہے؟ اس پر گھاس کا ایک تنکا بھی نہیں اُگتا۔ بتاؤ کیوں؟ ـــــ"

جلیل نے دھیان سے سنا۔ اب اس کے دھیان نے سینکڑوں ہزاروں کتابوں کے ورقوں میں دوڑ لگانی شروع کی۔ کتابوں سے بھری الماریاں کی الماریاں ختم ہو گئیں مگر دھیان کو وہ جگہ نہ ملی جہاں وہ ٹھہر کر بستی والوں کے سوال کا جواب پڑھتا اور اونچی آواز میں پڑھ کر جلیل کو سناتا۔

اب نور محمد نے کچھ کہنے کے لیے گردن اٹھائی۔ نقشہ مٹانے سے اس کا دایاں پیر اب تک گرد میں اٹا ہوا تھا۔ کہنے لگا "پھر بتاؤ نا۔ ٹیلے پر ہریالی کیوں نہیں اُگتی؟ ـــــ"

کسی کو محسوس ہوا کہ جلیل کے پاس اس سوال کا جواب نہیں ہے اور یہ کہ مہمان کو شرمندگی اٹھانی پڑ رہی ہے لہٰذا بات کا رخ موڑنے کے لیے کسی نے جلیل سے پوچھا "رات کو کہاں سونا چاہتے ہو، بڑی بیرک کے اندر یا پکے میدان کے پرلے باغیچے میں؟ ـــــ"

جلیل نے جواب دے کر بیرکوں سے اسٹیشن تک اور اجڑے ہوئے کنٹرول ٹاور سے ہوائی جہاز کے ڈھانچے تک سنسنی دوڑا دی۔ "میں آج کی رات اس ٹیلے پر سوؤں گا ـــــ وہاں، اس کی چوٹی پر۔ اور میں اپنے ساتھ لالٹین لے کر جاؤں گا اور اسے رات بھر جلائے رکھوں گا تاکہ تم لوگ دیکھ سکو کہ میں وہاں پہنچ گیا ہوں اور زندہ ہوں۔"

ساری بستی کی آبادی نے اُسے یوں دیکھا جیسے چاہنے والوں کو جی بھر کے آخری بار دیکھا جاتا ہے۔ اللہ وسائی کے کان میں لڑکیوں نے جلدی جلدی کچھ کہا لیکن اس نے بھی جلیل کو باز رہنے کا مشورہ نہیں دیا۔ کھانا ختم ہونے سے پہلے پہلے گاؤں کا ایک لڑکا آیا اور جلیل کے پاس جلتی ہوئی لالٹین رکھ کر خاموشی سے چلا گیا۔

اندھیرا چھانے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی۔ جلیل نے لالٹین اٹھائی، اپنا تھیلا دونوں کاندھوں پر لادا اور دیکھتے دیکھتے ریلوے لائین پھلانگ کر پار اُتر گیا اور جھاڑیوں میں گم ہو گیا۔ اس نے مڑ کر نہیں دیکھا مگر اپنی پشت پر گرم سانسوں جیسی ہوا سارے راستے محسوس کی۔

جھاڑیاں ختم ہوئیں۔ چھوٹے درخت آ گئے۔ یہ سارا علاقہ دریا کا پاٹ

رہا ہوگا۔ اس میں چشمے اب تک بہہ رہے تھے۔ ان کے کنارے بیلیں اُگی تھیں، کہیں کہیں اتنا پانی تھا کہ جلیل کو جوتے ہاتھ میں لے کر چلنا پڑا۔ وہ درختوں کے جُھنڈ میں اُترا تو ٹیلہ نظر آنا بند ہوگیا مگر اُس نے اپنا رخ نہ بدلا۔

کہیں کہیں بکریاں پتے کھا رہی تھیں۔ انھوں نے کان کھڑے کر کے اور گردنیں اٹھا کر جلیل کو حیرت سے دیکھا۔ ذرا آگے بڑھا تو جلیل نے محسوس کیا کہ پگڈنڈیاں ختم ہوگئیں۔ اور عین اُس وقت جب ایک اوزا ایکسپریس ٹرین زنانے بھرتی ہوئی بھولے جی کیمپ کے پلیٹ فارم سے سرخ بجری کی گرد اڑاتی ہوئی گزر رہی تھی، خشک مٹی کا بڑا سا انبار اچانک جلیل کے سامنے یوں آگیا جیسے ریلوے لائین ختم ہونے کے مقام پر مٹی کا ڈھیر لگا دیتے ہیں کہ ٹرین اگر رکنے نہ پائے تو اس میں دھنس جائے۔

ہوا کی سرسراہٹ بند ہوگئی۔ دریا کا شور گھٹی گھٹی آواز جیسا ہوگیا۔ سورج کی آخری کرن بجھ گئی اور اندھیرے کے پہلے لمحے میں جلیل نے دیکھا کہ سامنے خشک ٹیلہ تھکے ہوئے جانور کی طرح لیٹا ہے۔

جلیل نے لالٹین اونچی کر لی تاکہ اوپر چڑھنے کا راستہ نظر آسکے۔ ذرا دیر بعد وہ اوپر چوٹی پر پہنچ گیا۔ اس نے لالٹین نیچے رکھی، شانوں سے تھیلا اتارا اور مڑکر بھولے جی کی طرف دیکھا۔ اگر انسان کی آنکھیں جانوروں کی آنکھوں کی طرح چمکا کرتیں تو پرانی بیرکوں کی دیواروں پہ اسے چراغ سے جلتے نظر آتے۔ اس نے اطراف پہ ایک نگاہ ڈالی تو اس کا دھیان الماریوں میں چُنی کتابوں میں محاتجین کے قصے اونچی آواز میں پڑھ پڑھ کر سنانے لگا۔

وہ ایک اونچے پتھر پر بیٹھ کر اپنے ہاتھ پاؤں دیکھنے لگا۔ پھر تھیلے سے چھوٹا سا آئینہ نکالا اور لالٹین قریب سرکا کر اپنا چہرہ غور سے دیکھا۔

جب بھولے جی کی ساری روشنیاں ایک ایک کر کے بجھ گئیں تو اُس نے اپنا سلیپنگ بیگ نکال کر اچھی طرح بچھایا اور سگنلوں میں جلتی ہوئی لال اور ہری روشنیوں کو دیکھتا دیکھتا اور اللہ وسائی کی آڑ میں چھپی ہوئی لڑکیوں کے بارے میں سوچتا سوچتا سو گیا۔

اس کا خیال تھا کہ رات جنگلی جانوروں کے شور سے اُس کی آنکھ کھلے گی مگر یہ آنکھ صبح تڑکے چڑیوں کی چہکار سے کھلی۔ سرہانے رکھی ہوئی لالٹین بدستور روشن تھی اور صبح کی ہوا نے دریا کی سطح پہ جو چھوٹی چھوٹی لہریں اٹھائی تھیں ان سے پانی سفید جالی کی اوڑھنی جیسا نظر آ رہا تھا۔ ایسی سفید اوڑھنی جس پہ سفید ہی پھول کاڑھے جاتے ہیں۔

اُدھر سورج کی پہلی کرنیں پھوٹیں اِدھر بھولے جی کے چولہوں سے دھواں اُٹھا۔ جلیل نے چاہا کہ لالٹین بجھا دے لیکن یہ سوچ کر رک گیا کہ گاؤں والے اگر دیکھنے سے رہ گئے ہوں تو اب دیکھ لیں۔ دن روشن ہو گیا مگر اس نے لالٹین نہیں بجھائی یہاں تک کہ جب وہ واپس گاؤں میں پہنچا اس کے ہاتھ میں جلتی ہوئی لالٹین تھی۔ اب اُس کی نیچی لو اُس کے اُونچے حوصلے کی پہچان بن گئی تھی۔

وہ گاؤں کے قریب پہنچا تو ساری آبادی اس کی منتظر تھی۔ لڑکے ریل کی پٹڑی پہ چڑھ آئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اندھا جلیل ٹھوکریں کھاتا

بنوا آئے گا اور اس کا نچلا جبڑا ٹیڑھا ہو کر جھول رہا ہوگا۔

اس مرتبہ اُس نے گاؤں میں ایک فرق دیکھا۔ لڑکیاں اللہ وسائی کی آڑ سے نکل کر سامنے آ گئی تھیں۔

دن بھر جلیل ہوائی اڈے کی پیمائش کرتا رہا۔ گاؤں کے لڑکے اس کا ہاتھ بٹانے لگے۔ انھوں نے زندگی میں پہلی بار نقشہ بنتے ہوئے دیکھا اور دو چار سمجھدار لڑکوں نے تو اندازے سے یہ بھی بتا دیا کہ اس بڑے سے کاغذ پر بیرکیں کہاں بنیں گی، ریلوے لائن کس جانب ہوگی اور ایک لڑکا نہک کر بولا — "مجھے پتہ ہے۔ ٹیلہ اس جگہ بنے گا —"

جلیل نے غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ لڑکے نے غالباً پہلی بار ٹیلے کو منحوس نہیں کہا! البتہ یقیناً پہلی بار ایک فرمائش کی "آج رات جب ٹیلے پر چلو گے تو مجھے بھی لے چلو گے؟"

شام کو جب جلیل اپنا تھیلا اور لالٹین اٹھا کر چلنے لگا اور لڑکے کو ساتھ لے جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو پوری آبادی کی بھنویں تن گئیں۔ لڑکیاں دوبارہ اللہ وسائی کی آڑ میں چھپ گئیں اور اس کے کان میں کچھ کہنے لگیں۔

سارا گاؤں بیک آواز مخالفت کر رہا تھا "جاؤ جی جاؤ۔ ہمیں اپنے لڑکے کی موت منظور نہیں۔ لقوہ ہو جائے گا۔ اندھا ہو جائے گا۔ ابھی ہمیں ٹیلے سے نفرت ہے، تم سے بھی ہو جائے گی۔"

اس سارے شور کے درمیان اللہ وسائی کی آواز آئی "یہ سنو جی۔ لڑکے کو جانے دو — جب شہر کا نوجوان بہادر ہو سکتا ہے تو ہمارا لڑکا کیسے بزدل ہو سکتا ہے؟

وہ بھی خیر سے لوٹا تھا۔ یہ بھی خیر سے لوٹے گا۔" اللہ وسائی کہتی جا رہی تھی۔ لڑکیاں تائید میں سر ہلاتی جا رہی تھیں۔

اُس رات گاؤں والوں نے ٹیلے پر دو لالٹینیں جلتی دیکھیں۔ اگلے روز پھر نقشے بنے۔ کنٹرول ٹاور، رسد کا تہ خانہ، ہوائی اڈے کا باغیچہ۔ یہ سب اپنی اپنی جگہ کھینچ دیئے گئے۔ گاؤں کے لڑکوں نے پہلی بار سیکھا کہ شمال کدھر ہوتا ہے اور نقشے پر تیر کا نشان کیوں ڈالا جاتا ہے۔ اور جب انھوں نے یہ سیکھا کہ ایک گز میں کتنے فٹ ہوتے ہیں اس وقت تک ٹیلے پر چلنے کی فرمائش کرنے والوں کی تعداد تین ہو چکی تھی۔

اگلے روز لڑکوں نے یہ بھی سیکھ لیا کہ ایک فٹ میں کتنے انچ ہوتے ہیں اور اگلی رات نوجوانوں کا اچھا خاصا غول ٹیلے پر گیا۔

اور پھر یہ ہُوا کہ نقشہ مکمل ہو گیا۔ جلیل نے اپنا سامان باندھنا شروع کیا۔ اُسے اچھی طرح معلوم ہو چکا تھا کہ پسنجر ٹرین ہر روز کتنی لیٹ آتی ہے۔

اُس روز بھی سارے گاؤں والے اکٹھے ہوئے اور طرح طرح کی بولیاں بولنے لگے۔ اُس شور میں کہیں کہیں کچھ ایسی باتیں بھی سننے میں آ رہی تھیں کہ دیکھا، میں نہ کہتا تھا۔ مجھے پہلے سے پتہ تھا۔ اور میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا۔

"کیا کہہ دیا تھا" جلیل نے یہ بات کہنے والے کو مجمع میں ڈھونڈ لیا اور اُس سے پوچھا "کیا کہہ دیا تھا تم نے؟ —"

"یہی کہ ٹیلے سے نفرت کرنا ٹھیک نہیں —"

لڑکیاں منہ چھپا چھپا کر ہنسنے لگیں اور اللہ وسائی نے انہیں ایسے درہتر

رسید کیے جیسے سچ مچ مار رہی ہو۔

پسنجر گاڑی بڑی باقاعدگی سے لیٹ آئی اور گاؤں کے سامنے مرد جلیل کو رخصت کرنے اسٹیشن تک گئے۔ مجمع کے ساتھ لگے کھالیں چبانے والے کتے تک چلے آئے۔ جلیل نے اُس روز بیرکوں کی پرانی دیواروں پر چراغ جلتے دیکھے۔ غور سے دیکھا تو وہ شمعیں تھیں۔

گاڑی چلی تو جب تک پٹڑی ٹھن ٹھن بولتی رہی گاؤں کے لڑکے ہاتھ ہلاتے رہے۔ بالآخر سناٹا چھا گیا۔ سگنل مین نے کانٹا گرایا اور اسٹیشن ماسٹر اپنے کوارٹر میں واپس چلے گئے۔

اللہ بچایا کی قیادت میں یہ سارا مجمع گاؤں کی طرف چلا۔ لڑکے اپنی بہادری کے قصے سنائے جا رہے تھے کہ وہ کیسے نڈر ہو کر ٹیلے پر گئے اور کیسے چین سے سوئے اور کیسے اچھے اچھے خواب دیکھے اور یہ کہ ٹیلے میں نفرت کی کوئی بات نہیں۔

اچانک اللہ بچایا ٹھہر گیا۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے ٹیلے کو دیکھ رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر لڑکے بھی رک گئے۔ سریش پکانے والے مرد بھی رک گئے۔ دیواروں کے پیچھے سے ابھرے ہوئے لڑکیوں کے سر اونچے ہو گئے۔

وہ سب، ٹیلے کو دیکھ رہے تھے۔

پورے ٹیلے پر ہریالی اُگی ہوئی تھی۔ پورا ٹیلہ سبز اوڑھنی جیسا نظر آ رہا تھا۔ ایسی سبز اوڑھنی جس پر سبز ہی پھول کاڑھے جاتے ہیں۔

ذرّوں کے ساتھ رقص

اپنے اس عقیدے کے پختہ ہونے میں خود اُسے بھی شبہ نہیں تھا کہ زمین گول نہیں، چپٹی ہے، ایک جگہ رکی رہتی ہے اور سورج اُس کے اوپر گردش کرتا ہے۔

دوستوں کی محفل میں وہ اکثر یہ موضوع چھیڑتا، پھر بحث ہوتی اور جب کوئی کہتا کہ تمہارے پاس کیا دلیل ہے تو اس کا سیدھا سادہ جواب ہوتا۔ "میرا دل کہتا ہے۔"

اس دلیل کی تلاش میں اس نے دل سے باہر نکلنے کی کوشش بھی کی، کتب خانے کھنگالے، یونیورسٹیوں کے چکر کاٹے اور ایک ایک سے بات کر دیکھا۔

اپنے ذہن پر زور ڈالا تو خیال آیا کہ دنیا کی جتنی قدیم اور عظیم تہذیبیں تھیں ان کا بھی یہی اعتقاد تھا۔ یونان، روما، مصر، بابل اور چین کی تہذیبیں بھی کہتے کہتے عظمت کے آسمانوں تک جا پہنچیں کہ زمین اپنی جگہ رکی ہوئی ہے۔

کسی بڑی جامعہ کے بارے میں اس نے سُنا کہ وہاں اگر کوئی طالب علم کہے کہ زمین گول ہے اور اپنے محور پر گھومتی ہے تو اُسے جامعہ سے نکال دیا جاتا ہے۔

اور جب اس کا دل کہتا کہ زمین ساکت ہے اس وقت یہ بھی کہتا کہ ایک روز کہیں سے یہ خبر ضرور آئے گی کہ تم ہی سچے تھے۔

یہی ہُوا۔ وہ خبر آ گئی۔ کہیں سے اس کے کسی دوست نے اُسے ایک پرانی کتاب کے پرانے اشتہار کی نقل بھیجی۔ اشتہار میں لکھا تھا کہ اس کتاب میں تین دلائل دے کر ثابت کیا گیا ہے کہ زمین چپٹی ہے۔ تیس دلائل سے ثابت کیا گیا ہے کہ ساکت بھی اور پچاس دلائل سے ثابت ہُوا ہے کہ ساری گردش سورج کے حصے میں آئی ہے۔

دوست نے لکھا تھا کہ کتاب پرانی ہے اب نایاب ہے لیکن سنا ہے کہ لندن کی برٹش لائبریری میں اس کا ایک نسخہ محفوظ ہے۔

خط پڑھتے ہی وہ برٹش لائبریری جا پہنچا۔ لائبریری اور عجائب گھر دونوں اسی شاندار عمارت کے اندر تھے۔ چمکتی دھوپ میں برٹش میوزیم کے مضبوط ستونوں اور مستحکم محرابوں کو دیکھ کر وہ دل ہی دل میں مسکرایا اور دل ہی اندر ہی خود سے کہا کہ ہماری دولت لا کر یہ عمارت بنائی اور اب ہم پر حکم چلاتا ہے کہ زمین کو گول مانو۔

برٹش لائبریری کے ریڈنگ روم میں جانے کے لیے وہ بابل، یونان اور فارس کی گیلریوں سے گزرا اور گزرے وقتوں کی نشانیوں کو سلام کرتا گیا۔ راہ میں قدیم مصر کی گیلری بھی پڑی۔ حنوط شدہ لاشیں اپنے گرد پٹیاں لپیٹے آنکھیں موندے اپنے تابوتوں میں کیسے چین اور سکون سے لیٹی تھیں۔ وہ یہ سوچ کر مسکرا دیا کہ اگر لاشوں کی طرح ان کے خیالات بھی محفوظ ہو گئے ہوں

تو یہ یقیناً سوچ رہی ہوں گی کہ زمین ہموار اور ساکت ہے۔

لائبریری کے ڈیسک پر اس نے اپنی کتاب نکالنے کی درخواست کا فارم بھرا اور اپنے مطالعے کے ڈیسک پر بیٹھ کر اونچے روشن دان سے بڑی لکیر کی طرح اندر آنے والی دھوپ کو دیکھنے لگا۔ اسی دوران کتب خانے کا کارندہ دبے پاؤں آیا اور پرانی جلد کے اندر بھورے بھورے کاغذوں کی ایک کتاب اُس کے سامنے رکھ گیا۔ کاغذ اپنی قدامت سے چورا چورا ہوئے جا رہے تھے۔ لیکن جوں ہی اُس نے کتاب کھولی، اُس کی نگاہوں کے سامنے علم و دانش کے روشن دان کھلنے لگے۔ دلائل بارش کی جھڑی بن کر اُس کے خشک اور پیاسے ذہن پر برسنے لگے۔ ورق الٹتے گئے۔ بیس دلائل نے اُس کا یہ خیال سچ ثابت کر دکھایا کہ زمین گول نہیں ہے۔ تیس دلائل نے اس کا یہ یقین راسخ کر دیا کہ زمین ساکت ہے اور کتاب کے خاتمے تک طے پا گیا کہ سب کچھ رُکا ہُوا ہے، ایک سورج ہے جو گردش میں ہے۔

اسی دوران دن ڈھلنے لگا اور روشن دان کے راستے آنے والی دھوپ نے مغربی دیوار سے مشرقی دیوار تک سفر طے کر کے کتاب کے دلائل کو اور وزنی بنا دیا۔ خوش ہو کر اس نے کتاب کو اتنی زور سے بند کیا کہ لائبریری کا سناٹا ٹوٹ گیا اور کتابوں پر جھکی ہوئی سینکڑوں گردنیں کسی مشین کی طرح یک وقت اٹھیں اور اُسی مشین کی طرح دوبارہ جھک گئیں۔ کتاب کے اندر سے اٹھنے والے پرانے کاغذ کے سفوف کے ذرّے روشن دان کے راستے آنے والی دھوپ کی شعاعوں میں جا کر رقص کرنے لگے۔ اُس وقت اس

کا جی چاہا کہ ذروں کے ساتھ مل کر ناچے۔

اُسی وقت لائبریری کی گھنٹی بج گئی۔ کتب خانہ بند ہونے کا وقت قریب تھا۔ گھنٹی سے مراد یہ تھی کہ تحقیق کے مارے ہوئے اور تجسس کے ستائے ہوئے لوگ اب اپنا مال اسباب سمیٹیں اور نہ صرف لائبریری بلکہ عجائب گھر کی عمارت سے باہر تشریف لے جائیں۔

اس نے ماتھے پر بکھرے ہوئے بالوں کو ایک ہاتھ سے درست کیا اور یہ سمجھتے ہوئے کہ درست ہو گئے ہیں، میوزیم کے بیرونی دروازے کی طرف چلا۔

یہ وہ دن تھا جب اس کے دل کی حدیث صحیح نکلی۔

سکندرِ اعظم کی طرح فتح کا احساس لیے وہ مقدونیہ کی گیلری سے گزرا تو دیکھا کہ لائبریری اور عجائب گھر آنے والے سینکڑوں لوگوں کا مجمع باہر کی سمت رواں ہے۔ اُس نے خود کو اس ریلے میں ڈال دیا اور خود بھی اس کے ساتھ بہنے لگا۔

گیٹ پر دو محافظ کھڑے تھے جو باہر جانے والوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ وہ اُن کے قریب سے گزر ہی رہا تھا کہ ایک نے اُس کا بازو کس کر پکڑ لیا: "کہاں جا رہے ہو؟"

"گھر"

"نہیں۔ تم نہیں جا سکتے۔"

"کیوں؟—"

"کیونکہ حنوط شدہ لاشوں کو عجائب گھر سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ جاؤ اور اپنی پٹیاں دوبارہ لپیٹ کر خاموشی سے اپنے شوکیس میں لیٹ جاؤ۔"

وہ آنکھیں پھاڑے، حیرت سے محافظ کے چہرے کو تکنے لگا اور اُسے بالکل یوں لگا جیسے زمین اپنے محور پر گھومتے گھومتے اچانک رک گئی ہو۔

سیانا

باپ بیٹے میں عرصے سے جھگڑا چل رہا تھا۔

حامد علی کہتے تھے کہ مجھے ابّا نہیں، بھیّا کہا کرو۔ شاہد کا اصرار تھا کہ دوسرے لڑکوں کی طرح وہ بھی ابّا ہی کہے گا۔ کبھی کبھی بحث ہوتی۔ شاہد کہتا کہ ابا کہنے میں کیا نقصان ہے۔ حامد اپنی ذرا سی خجالت اور تھوڑی سی شرمندگی چھپاتے ہوئے جواب دیتے "دیکھو۔ میرے چہرے کی طرف دیکھو۔ میرے کالے بالوں کو دیکھو۔ سیاہ داڑھی کو دیکھو۔ ابھی میری عمر ہی کیا ہے۔ تو مجھے ابا کہے گا تو دنیا مجھے بوڑھا کہے گی۔ ویسے بھی بہت سے باپ خود کو بھیّا اور مائیں اپنے آپ کو باجی کہلواتی ہیں۔ ہمارے بزرگوں کا یہی چلن تھا۔ اس میں بُرائی کیا ہے؟——"

"ابا تم تقریریں بہت کرتے ہو۔ اسی لیے لوگ تمہیں مولوی کہتے ہیں۔" بیٹا مُنہ پھلا کر جواب دیتا اور حامد علی کو لاجواب کر دیتا۔

دوسرا جھگڑا بالکل ہی مختلف تھا۔ حامد علی سیانے تھے۔ لڑکیوں کے سر پر آسیب کا سایہ ہو تو یہ جا کر جن اتارا کرتے تھے۔ ان کا یہ کاروبار خوب چلتا تھا۔ زندگی آرام سے گزر رہی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کام میں

اُن کا جی لگتا تھا۔ شاہد ان کا اکلوتا بیٹا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ بزرگوں کا پیشہ گھر میں رہے۔ بڑا ہو کر وہ بھی عامل بنے اور وہ بھی آرام کی کھائے لیکن لڑکا اپنی ضد پر اڑا ہوا تھا۔

حامد علی پوچھتے "آخر کیوں نہیں؟"

شاہد جواب دیتا "بس میں ویسے ہی بہت سیانا ہوں۔ مجھے تم جیسا سیانا نہیں بننا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ جن، بھوت اور پریت نوجوان لڑکیوں ہی کے سر پر کیوں آتے ہیں۔ بوڑھی عورتوں کے سر پر کیوں نہیں آتے۔ اس کے علاوہ ہمیشہ ہندو لڑکیوں کے سر پر کیوں آتے ہیں۔ اور پھر یہ کہ تم جب بھی ان کے نام پوچھتے ہو ہمیشہ مسلمانوں کے نام بتاتے ہیں۔ مجھے ایسے جن نہیں اتارنے ہیں۔ یوں بھی دنیا مجھے مولوی صاحب کہنے لگے گی۔ بلا وجہ"

بیٹے کا جواب سن کر حامد علی کی آنکھوں سے شرارت ٹپکنے لگتی "دیکھو۔ اب کے تو لمبی تقریریں کر رہا ہے 'مولوی صاحب!'"

اور دونوں دیر تک جی بھر کر ہنستے۔

سورج ابھی سر پر تھا کہ بھگوان پورے لالہ امرناتھ کا ملازم دوڑتا ہوا آیا۔ پسینے سے اس کے بال بھیگ کر سر سے چپک گئے تھے "مولوی ساب' مولوی ساب' جلدی چلیے جلدی چلیے۔ ادما دیدی پھر کھیل رہی ہیں۔ صبح گھاٹ پر گئی تھیں۔ بس اس کے بعد سے حالت خراب ہے۔ کوئی بڑا کٹھور آسیب ہے۔ دیدی نے اپنا حال بُرا کر لیا ہے۔ لالہ جی نے کہا ہے کہ فوراً آئیے مولوی

ساب، جلدی کیجیے۔"

حامد علی دروازے میں کھڑے ساری داستان سنتے رہے اور اپنا تبسم چھپانے کی کوشش کرتے رہے۔ شاہد ان کی آڑ سے جھانکتا رہا۔ اس کی کھلی کھلی رنگت اور بھنورے جیسی کالی کالی آنکھوں والے چہرے پر شوخی کی لہریں دوڑنے لگیں۔ حامد علی نے جلد آنے کا وعدہ کر کے جوں ہی لالہ جی کے نوکر کو رخصت کیا، وہ بولا "لو پھر آ گئے کوئی جعفر شاہ، نور خاں، رحم دین۔"

"چپ رہ" حامد علی نے ڈانٹنے کی کوشش کی۔ "جنوں کے نام ایسے لیتا ہے جیسے سارے کے سارے تیرے تایا لگتے ہیں۔"

آسیب اتارنے کا عمل چونکہ عشا کے بعد ہوتا ہے اس لیے حامد علی کو کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ اطمینان سے نہا دھو کر تیار ہوئے بال سنوارے، آنکھوں میں سرمہ لگایا۔ گلے میں رومال ڈالنے لگے تو اس میں عطر لگایا۔ پھر اتنے ہی اطمینان سے گھوڑی کھولی، زین کسی، اس پر شاہد کو بٹھایا اور کھیتوں کے راستے بھگوان پور کی طرف چل پڑے۔

دھان کے کھیتوں میں کھڑا ہوا پانی ڈوبتے سورج کے عکس سے آئینہ سا بن گیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے پرندے پانی کی سطح سے لگے لگے اڑ رہے تھے۔ کہیں سے تتلیوں کے جھنڈ آ گئے تھے اور ہوا میں کونپلوں کی خوشبو تھی۔ سونے جیسی دھوپ، لہروں پر ڈولتی دھان کی ہری ہری کو ہاتھ لگا کر شاہد کے چہرے کو چھو رہی تھی اور اس کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ وہ بولا "ابا، مجھے یہ دھوپ بہت بری لگتی ہے، مجھ کو دھوپ کا چشمہ دلا دو۔"

حامد علی خفا ہوئے "پھر تو نے ابا کہا۔ لاکھ دفعہ سمجھایا ہے کہ مجھے بھیا کہا کر۔ جب تک بھیا نہیں کہے گا، کوئی چشمہ وشمہ نہیں دلاؤں گا۔"

گھوڑی کی آنکھوں میں سورج کا عکس پڑا تو وہ بیکل ہوئی۔ حامد علی بولے "کیا ہے ری؟"

شاہد بولا "اس کے سر پر شاہد علی آ گیا ہے۔ وہ اس کی ناک میں مرچوں کی دھونی۔"

دونوں ہنسنے لگے اور بھگوان پور کے جامعہ اسلامیہ کے اونچے میناروں کو دیکھنے لگے۔

بازار میں دودھ کے کڑھاؤ چڑھا دیے گئے تھے۔ جلیبیاں تلی جا رہی تھیں، لڑکے ڈوری میں بندھی بوتلیں لٹکائے مٹی کا تیل خریدنے جا رہے تھے۔ پنواڑی اپنے پانوں پر پڑے ہوئے لال کپڑے پر پانی چھڑک رہا تھا۔ سائیکل والا ٹیوب میں ہوا بھر کر اور اسے پانی کے تسلے میں ڈال کر پنکچر ڈھونڈ رہا تھا۔ کتے لڑ رہے تھے اور ہومیوپیتھک ڈاکٹر مریضوں کا انتظار کرتے کرتے کرسی ہی پر سو گیا تھا اور اس کے ہاتھ سے چھٹ کر قلم فرش پر گر گیا تھا اور لڑھک کر دور چلا گیا تھا۔

حامد علی بستی میں داخل ہوئے تو ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں: مولوی صاحب سلام، مولوی صاحب نمشکار، مولوی صاحب جی سلام علیکم۔ وہ ہر ایک کے سلام کا جواب دیتے گئے۔ راستے میں منشی رام سہائے ملے۔ وہ سفید براق کپڑے پہنے، چوبی چھڑی ہلاتے ہوئے چہل قدمی کے لیے جا رہے تھے۔ انھوں نے مولوی

صاحب کو جھک کر سلام کیا" آداب عرض ہے " ان کی تین بیٹیوں کے سروں پر جن کثرت سے آیا کرتے تھے چنانچہ حامد علی سے ان کی صاحب سلامت اچھی خاصی تھی۔

لالہ امرناتھ کے دونوں چھوٹے بھائی دروازے پر کھڑے بڑی بیتابی سے حامد علی کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کے لیے فوراً بیٹھک کھلوائی گئی۔ گھوڑی کھڑکی کی ایک سلاخ سے باندھی گئی اور ان کے ایک بھائی نے شاہد کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا" ارے تیری آنکھوں میں کتنی سمجھداری ہے۔ لگتا ہے تو بھی بڑا سیانا نکلے گا۔ ہے کہ نہیں بے ــــ"

شاہد نے ایسی صورت بنائی جیسے کوئی کڑوی گولی نگل لی ہو۔

گھر کے اندر دھما چوکڑی مچی ہوئی تھی۔ اوما دیدی کے نرخرے سے نکلنے والی آوازیں باہر تک سنائی دے رہی تھیں" کھا جاؤں گا مولوی کو۔ کچا چبا جاؤں گا مولوی کو ــــ"

حامد علی نماز پڑھنے جامعہ اسلامیہ چلے گئے۔ شاہد گھوڑی کو سہلانے لگا۔ یہاں تک کہ عشا کی اذان ہو گئی۔

ادھر اندھیرا ہوا اُدھر اوما کے سر سے جن اتارنے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ آنگن میں انگیٹھی رکھ کر اس میں کوئلے دہکائے گئے۔ اس کے برابر میں مٹی کی ہنڈیاں اور ان کے ڈھکن رکھے گئے۔ گارا گوندھا گیا۔ ایک کونڈے میں لال مرچیں رکھی گئیں اور مولوی صاحب کا انتظار شروع ہو گیا۔

جوں ہی حامد علی آسیب اتارنے آئے، اڑوس پڑوس کی چھتوں سے درجنوں

سر نمودار ہو گئے۔ یہ منظر لوگ کئی بار دیکھ چکے تھے لیکن ہر مرتبہ تازہ دم تماشبینوں جیسے اشتیاق سے دیکھا کرتے تھے۔

تمام گھر والے سامنے بیٹھ گئے۔ شاہد قریب پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھا طاق میں رکھی ہوئی مورتیوں کے مراود ہاتھ گننے لگا۔

عمل شروع ہوا تو سناٹا چھا گیا۔ اوما کو گھر کے سارے مرد پکڑ کر اندر سے لائے۔ اس کی حالت خونخوار بھیڑیے جیسی تھی۔ اس میں بلا کی قوت آگئی تھی اور اس پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ ایک چچا کے منہ پر اُس نے ایسا طمانچہ مارا کہ انگلیوں کے نشان بن گئے۔ وہ نوکر جو حامد علی کو بلانے گیا تھا، اس وقت بھی اس کے بال سر سے چپکے ہوئے تھے۔ اُس نے اوما کو پیچھے سے پکڑ رکھا تھا۔ اُسے پتہ تھا کہ وہ سامنے آگیا تو پہلے کی طرح زور کی لات کھائے گا۔

اوما کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور چہرہ مسخ ہو رہا تھا۔ شاہد نے خود سے کہا" کتنی بدصورت ہو رہی ہے"

حامد علی دیہات کے پلے ہوئے کھاتے پیتے جوان تھے۔ انہوں نے اوما کو ایسا دبوچا کہ ان کی انگلیاں لڑکی کے بازوؤں میں پیوست ہونے لگیں۔ اوما نرخرے سے آوازیں نکال رہی تھی" مولوی میں تیری کھال اتار کر اس میں بھس بھروا دوں گا ــــ مولوی میں تیری کھال کے جوتے بنوا دوں گا۔ مولوی اپنی کھال میں رہ"

حامد علی یہ سن کر محظوظ ہوئے اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر اوما پر

پھونکا تو وہ اور زور زور سے چیخنے لگی ۔ حامد علی تقریر کے ماہر تھے اور جانتے تھے کہ لمبی گفتگو ہو تو لڑکی کھیلنا بند کر کے سننے لگتی ہے ۔ وہ بولے " دیکھ کان کھول کر سن ۔ تیرے سینکڑوں بھائی بھتیجوں کو جہنم واصل کر چکا ہوں ۔ ہنڈیا میں دفن ہیں آج تک دُہائی دے رہے ہیں ۔ میں بھی کمزور نہیں ہوں میں نے تیرے جیسوں کا اکثر کچومر نکالا ہے ۔ مار مار کے بھرکس نکال دوں گا ۔ اِس آگ میں نہ جھلسایا تو میرا نام بھی حامد علی ابن عابد علی نہیں ۔ یہ ہنڈیاں دیکھ رہا ہے شیطان ۔ ان کے اندر قید ہو کر عمر بھر روئے گا ۔ پھر چیخے گا چلائے گا ، معافیاں مانگے گا ، خبیث شیطان کہیں کے ۔ بول کیا نام ہے تیرا ؟ ــــ "

" نہیں بتاؤں گا "

" تیرا تو باپ بھی بتائے گا ۔ اچھے اچھوں کے نام پوچھے ہیں میں نے ۔ بتا کیا نام ہے تیرا ــــ "

اب ادما خاموش ہو گئی ۔ وہ چلائے " اب بولتا کیوں نہیں ۔ بولے گا یا دوں مرچوں کی دھونی ؟ بول کیا نام ہے تیرا ؟ "

یہ کہتے کہتے حامد علی نے کونڈے سے کچھ لال مرچیں نکالیں ۔ ادما کو اچھی طرح جکڑا ۔ ایک ہانڈی میں انگارے ڈالے ۔ ان میں مرچیں جھونکیں اور ہانڈی ادما کی ناک سے لگا دی ۔ وہ بُری طرح کھانسنے لگی اور نرخرے سے آوازیں نکال کر مولوی صاحب کو مردانہ گالیاں دینے لگی ۔ لالہ امرناتھ شرمندہ ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگے اور گھر والوں سے بولے " چلو ، تم لوگ اندر جاؤ "

کوئی نہیں گیا ۔

اب حامد علی نے ادما کی چوٹی پکڑی اور منہ ہانڈی میں ڈالتے ہوئے بولے ــــ " بتا کیا نام ہے تیرا ۔ بتا کیا نام ہے تیرا ؟ ــــ "

جواب ملا ــــ " برکت شاہ ابن شوکت شاہ "

شاہد مسکرایا ۔

حامد علی چلائے " برکت شاہ ، میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ اس ہانڈی میں اُتر جا ــــ " یہ کہہ کر وہ کچھ پڑھنے لگے اور پھونکنے لگے ۔

پھر نرخرے سے آواز آئی " نہیں اتروں گا "

اب مکالمہ شروع ہو گیا ۔ حامد علی بولے " کہاں سے آیا تھا تو لڑکی کے سر پہ "

جواب ملا ــــ " صبح یہ گھاٹ پر جا رہی تھی "

" اچھا پھر ؟ ــــ "

" یہ کمپنی باغ کے کٹھل کے درخت کے نیچے سے گزری "

" کہاں سے ہے "

" جہاں جن سنگھی ڈرل کرتے ہیں "

" پھر ؟ "

" پھر میں اس کے سر پہ آگیا "

" اچھا چل اب اتر جا سیدھی طرح سے "

" نہیں اتروں گا ، نہیں اتروں گا "

ادھر برکت شاہ کی ضد جاری تھی ، ادھر ہانڈی میں اُور دہکتے ہوئے کوئلے اور چمکتی ہوئی سرخ مرچیں جھونکی جا رہی تھیں ۔ حامد علی نے لڑکی کی گدی پکڑ کر

اس کی ناک ہانڈی میں دے دی۔

اب ہانڈی کے اندر سے گھٹی گھٹی سی آوازیں آنے لگیں "میری توبہ میری توبہ۔"

"اتر جا پھر۔"

"میری توبہ میری توبہ۔"

یہ سن کر حامد علی نے لڑکی کی گردن کو جھٹکے دینے شروع کیے اور آخری بار کچھ پڑھ کر اس کے سر پر پھونکا۔ اچانک اوما نے تڑپنا شروع کر دیا۔ وہ اپنی دونوں ٹانگیں یوں چلانے لگی جیسے ضدی بچے مچلتے ہیں۔ حامد علی نے بھی اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کی۔ تڑپتے تڑپتے اوما کے مچلنے کا زور ٹوٹنے لگا۔ اس کے ہاتھ پیروں سے سختی زائل ہونے لگی اور اس نے اپنی آواز میں باپ کو پکارا ۔۔ باؤجی، باؤجی۔"

حامد علی نے جھٹ ہنڈیا اس کے چہرے سے ہٹائی اور فوراً ہی اس پر ڈھکن رکھ کر گارے سے ہنڈیا کا منہ بند کرنا شروع کر دیا۔

اوما پسینہ پسینہ ہو گئی۔ اس نے نڈھال ہو کر اپنا سر حامد علی کے زانو پر رکھ دیا اور بے سدھ ہو گئی۔ کچھ دیر بعد حامد علی نے اشارہ کیا تو گھر والے لڑکی کو اٹھا کر اندر کمرے میں لے گئے۔ دوسرے لوگ بھی اس کی حالت دیکھنے اندر چلے گئے۔ حامد علی گلے میں پڑے ہوئے رومال سے اپنے چہرے کا پسینہ پونچھنے لگے۔ سامنے چارپائی پر پڑا ہوا شاہد گہری نیند سو رہا تھا۔

اس کے لیے اس عمل میں کوئی کشش، کوئی نئی بات نہیں رہ گئی تھی۔

بھوت پریت کے شور شرابے میں بھی وہ مزے سے سو جاتا تھا۔ مرچوں کے دھوئیں سے وہ سوتے سوتے ایک دو بار کھانستا اور پھر کروٹ بدل کر سو جاتا۔

ایک روز صبح سویرے اس کی آنکھ کھلی تو قریب سوئے ہوئے باپ کے سر پر نگاہ گئی۔ اُس نے دیکھا کہ حامد علی کی قلموں میں ایک بال سفید ہو رہا ہے۔ وہ لیٹے لیٹے مسکرانے لگا۔ باپ سو کر اٹھے تو وہ بولا "۔۔ ابا، تمہارے سر کے بال سفید ہو رہے ہیں۔ اب تو میں تمہیں کبھی بھی بھیا نہیں کہوں گا۔"

حامد علی بولے "۔ تیری بھی مونچھیں نکلنی شروع ہو گئی ہیں۔ تو بھی کوئی بچہ نہیں رہا۔۔۔۔"

اس دوران بہت کچھ بدل گیا، اب کہیں سے بلاوا آتا تو حامد علی گھوڑی پر بیٹھتے اور شاہد اس کی لگام تھام کر پیدل چلتا۔ دھان کی کونپلوں کی خوشبو اب اُسے اچھی لگتی۔ پانی پر چمکتے سورج کی ہلکی ہلکی حرارت اس کے رخساروں کو چھوتی تو اس کی آنکھیں کسی اور طرح سے بند ہونے لگتیں۔ تتلیاں اڑتے اڑتے اس کا راستہ کاٹتیں تو وہ اس امید میں آہستہ سے ہاتھ بڑھا دیتا کہ شاید کوئی تتلی اس کے ہاتھ کی پشت پر بیٹھ جائے۔

اُس رات شانتی کے سر سے جن اتارا گیا تو شاہد خاموش کھڑا دیکھتا رہا۔ جس وقت لعل شاہ کو ہانڈی میں بند کیا جا رہا تھا، وہ دیکھ رہا تھا کہ حامد علی نے لڑکی کو پکڑ کر کس طرح اپنے سینے سے لگا رکھا ہے۔ لڑکی کے نرخرے سے مردانہ آوازیں نکل رہی تھیں تو اسے صاف نظر آ رہا تھا کہ حامد علی کا

ہاتھ لڑکی کی کمر کے گرد ہوتا ہُوا کہاں تک پہنچ رہا ہے۔ لوگ جن کی باتیں سن رہے تھے۔ وہ باپ کی سانسیں سن رہا تھا۔ وہ مجمع میں کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا کہ اُسے گھبرا کر بیٹھنا پڑا۔ وہ خود اپنی سانسوں پر حیران تھا۔

شانتی برابر والے کمرے میں سلا دی گئی۔ حامد علی بھی بیٹھک میں لمبی تان کر سو گئے لیکن شاہد جاگتا رہا۔ اُسے یوں لگا کہ اس کی آنکھوں میں انگاروں جیسے منظر اتار کر کسی نے اُوپر سے ڈھکن رکھ کر گارے سے بند کر دیا ہے۔

ناشتہ کر کے دونوں گاؤں کی طرف روانہ ہوئے۔ حامد علی گھوڑی پر بیٹھے بیٹھے بنواری لال کے گھر سے ملنے والے نوٹ گنتے جا رہے تھے۔ شاہد لگام تھامے آگے آگے چل رہا تھا۔ صبح کی ٹھنڈی دھوپ میں اس کے رخساروں کے سنہرے روئیں چمک رہے تھے۔ دو تتلیاں ایک دوسرے کا تعاقب کرتے کرتے شاہد کے بالوں سے اُلجھ گئی تھیں اور حامد علی یہ دیکھ کر خوش تھے کہ بنواری لال نے انہیں پچاس روپے زیادہ دیئے ہیں۔ ابھی وہ یہ خبر شاہد کو سنانے ہی والے تھے کہ اس کی آواز آئی۔

"بھیا ــــــ"

حامد علی کے پاؤں رکابوں سے نکلتے نکلتے رہ گئے۔